OPEN ACCESS
RUSHAD
(Bi-Annual Research Journal of Islamic Studies)
Published by: *Lahore Insititute for Social Scicnces, Lahore.*

ISSN (Print): 2411-9482
ISSN (Online): 2414-3138
Jul-Dec-2020
Vol: 1, Issue: 2
Email: journalrushd@gmail.com
OJS: https://rushdjournal.com/index

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر[1]

غیر سودی بینکاری: ایک تجزیاتی مطالعہ

Abstract

This research paper examines the ideological contestation between opponents and proponents of Islamic Banking in Pakistan. Major part of the research is based on Sharīʿah and jurisprudential study of 'modes of financing' in Islamic Banks. It explores the agreements and similarities between conventional and Islamic Banking along with analysis of the fact that the existing system in Islamic Banks is based on illegal tricks and subterfuges while at the same time apparently there seems to be some fractional support to this system from Islamic Law as well. Nevertheless, the real Sharīʿah objectives for implementation of these laws have been severely trampled in practice .

Therefore, whether there are interest-free banks or conventional interest banks, they all are in fact disassociated with trade or any kind of business and they primarily deal in money. This is the opinion of Ahl al-Ḥadīth and majority scholars of Ḥanafī school of thought in Pakistan, although foundation of such business institutions is the need of the Islamic society where genuinely on the basis of Sharīʿah principles, Musharakah and

---

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف ہیومینیٹیز، کامساٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور۔

Muḍārabah could be undertaken.

بینک اٹلی زبان کے لفظ "banko" سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنیٰ 'میز' ہے۔ شروع شروع میں جب اس ادارے کا آغاز ہوا تھا تو اس کو چلانے والے حضرات کھاتے داروں کے حساب و کتاب کے لیے ایک میز کو اپنے سامنے رکھتے تھے کہ جس پر سبز رنگ کا کپڑا پڑا ہوتا تھا' اسی سے لفظ بینک وجود میں آیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا ماڈرن بینک اٹلی (جینوا) میں 1407ء میں وجود میں آیا جس کا نام 'بینک آف سینٹ جارج' تھا۔[1] ایک جدید بینک کی عام طور پر یہ تعریف کی جاتی ہے:

> "بینک قرضوں کا کاروبار کرتا ہے۔ عوام سے امانتیں وصول کرتا ہے اور ضرورت مند افراد کو قرضے فراہم کرتا ہے، بینک کے جاری کردہ زرِاعتبار (مالِ حکمی) کو عام لوگ بلاحیل وحجت قبول کر لیتے ہیں۔ اس لیے بینک زر کی تخلیق بھی کرتا ہے۔"[2]

زرِ اعتبار سے مرادوہ زر(مال) ہے جو حقیقی نہ ہو مثلاً کرنسی نوٹ، بانڈز' بینک کے چیکس (cheques) وغیرہ۔ اس کے بالمقابل حقیقی زر سے مرادوہ سونا ہے جو کرنسی نوٹ، بانڈز یا چیکس وغیرہ کے پیچھے موجود ہوتا ہے اور یہ ایک طرح کی اس سونے کی رسیدوں کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں جنہیں لوگوں کے معاشی مسائل حل کرنے کے لیے سہولت کے پہلو سے جاری کیا جاتا ہے۔ پہلے پہل کرنسی نوٹ اس وقت جاری کیے جاتے تھے جبکہ ان کے پیچھے ان کی مالیت کا سونا موجود ہوتا تھا لیکن اب یہ شرط اٹھالی گئی ہے اور کوئی بھی ملک سونے کی موجودگی کے بغیر بھی کرنسی نوٹ چھاپ سکتا ہے۔

جدید بینکاری کی تاریخ

جدید بینکنگ کا آغاز کیسے ہوا؟ اس بارے میں مولانا مودودی رحمہ اللہ (متوفی1979م) نے اپنی کتاب 'سود' میں عمدہ بحث کی ہے۔ مولانا نے جدید بینکنگ کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جس کا خلاصہ ہم اپنے الفاظ میں یہاں نقل کر رہے ہیں۔

---

[1] Unknown, Bank, Retrieved March 03,2012, from http://:en.wiki pedia.org/wiki/Bank-

[2] عبد الحمید ڈار، پروفیسر، محمد عظمت، پروفیسر، محمد اکرم میاں، پروفیسر، اسلامی معاشیات، (لاہور: علمی کتاب خانہ، س ن): 305۔

ابتدائی مرحلہ

مغربی ممالک میں شروع شروع میں جبکہ ابھی تک کاغذی نوٹ ایجاد نہیں ہوئے تھے، لوگ اپنی قیمتی امانتیں، سونا اور چاندی وغیرہ سناروں کے پاس بطور امانت رکھوا دیتے تھے۔ سنار ہر امانت دار کو اس کی امانت کے بقدر سونے کی ایک رسید جاری کر دیتا تھا جس میں یہ تصریح ہوتی کہ فلاں شخص کا اتنا سونا میرے پاس بطور امانت محفوظ ہے۔ آہستہ آہستہ یہ امانتی رسیدیں خرید و فروخت اور قرضوں کی ادائیگی کے لیے استعمال ہونے لگیں اور لوگ ان رسیدوں پر اعتماد کرنے لگے جس کی وجہ سے ایک شخص کو سنار کے پاس سے سونا نکلوانے کی ضرورت بہت کم پڑتی تھی۔ تجربے سے سناروں کو یہ معلوم ہوا کہ لوگوں کا جو سونا ان کے پاس بطور امانت محفوظ ہے لوگ اس کا دسواں حصہ ان سے نکلواتے ہیں اور نو حصے سونا ان کے پاس بے کار پڑا رہتا ہے۔ اب سناروں نے اس امانتی سونے کو دوسرے لوگوں کو سود پر ادھار دینا شروع کر دیا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نو حصے سونے کی رسیدیں بھی سود پر آگے جاری کرنا شروع کر دیں یعنی وہ سونا پھر ان کے پاس موجود تھا لیکن ان کی رسیدیں وہ سود پر جاری کر رہے تھے۔ یہ ایک قسم کا دھوکا، فراڈ اور لوگوں کی امانتوں کا غلط استعمال تھا۔

دوسرا مرحلہ

دوسرے مرحلے میں ان سناروں نے اپنے کاروبار کو وسیع کرنے کے لیے معاشرے کے متوسط اور خوش حال طبقوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنا سرمایہ کاروبار میں لگانے کی بجائے ہمارے پاس بطور امانت رکھوا دیں ہم آپ کو اس پر سود ادا کریں گے۔ اسی طرح سنارے کم شرح سود پر لوگوں سے ان کا سونا وغیرہ لے لیتے تھے اور زیادہ شرح سود پر دوسرے لوگوں کو دے کر اپنا منافع درمیان میں رکھ لیتے تھے۔ بہت سارے لوگوں نے سوچا کہ کاروبار میں نقصان کا اندیشہ بھی ہے۔ وقت بھی لگے گا اور محنت بھی کرنا پڑے گی۔ حساب کتاب بھی رکھنا ہو گا اور نفع میں اتار چڑھاؤ بھی رہتا ہے۔ ان سب باتوں کو سوچتے ہوئے لوگوں میں اس طرف رجحان بڑھنے لگا کہ اپنا کاروبار شروع کرنے کی بجائے اپنا سونا وغیرہ سناروں کے پاس رکھوا کر ایک متعین شرح سود حاصل کی جائے کہ جس میں اصل زر بھی محفوظ رہے گا اور محنت بھی نہ کرنا پڑے گی۔ وقت بھی بچ جائے گا اور نقصان کے اندیشوں سے بھی بچے رہیں گے۔ اس طرح معاشرے کے تقریباً 90 فی صد سرمایے پر ان سناروں کا

قبضہ ہوتا چلا گیا۔[1]

تیسرا مرحلہ

تیسرے مرحلے میں سناروں نے اپنے کاروبار کو اجتماعی شکل دینا شروع کر دی۔پہلے جو کام وہ انفرادی سطح پر کرتے تھے اب انہوں نے وہ گروپ کی شکل میں کرنا شروع کر دیا۔اس مرحلے میں جدید بینک وجود میں آنا شروع ہو گئے۔بینک اگرچہ چھوٹے بڑے بہت سے کام کرتا ہے لیکن اس کا اصل کام آج بھی یہی ہے کہ کم شرح سود پر لوگوں سے ان کی رقوم بطور امانت لینا اور زیادہ شرح سود پر مختلف افراد، کمپنیوں اور اداروں کو قرضے جاری کرنا۔بینک کے ادارے میں دو طرح کا سرمایہ ہوتا ہے،ایک ان افراد کا سرمایہ کہ جو مل کر ایک بینک بناتے ہیں اور دوسرا ان کھاتے داروں کا سرمایہ جو بینک میں اپنی رقوم بطور امانت رکھواتے ہیں۔بینک کا اصل سرمایہ دوسری قسم کا ہوتا ہے جو کل سرمایے کا تقریباً85سے90فی صد ہوتا ہے۔

غیر سودی بینکوں کی تاریخ کا ایک اجمالی جائزہ

غیر سودی یا اسلامی بینکوں کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔سب سے پہلا غیر سودی بینک مصر میں 1963ء میں بنایا گیا جس کا نام 'مت غمر سوشل بینک' تھا۔اس بینک میں زراعت کے لیے رقوم جمع کرنے اور قرضے فراہم کرنے کا کام جاری ہوا تھا۔اسی سال ملائیشیا میں حج کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کا نام 'تبونگ حاجی' تھا۔لوگ اس ادارے میں اپنی بچتیں جمع کرواتے اور حسب ضرورت قرض لیتے تھے۔1975ء میں 'دوبئی اسلامی بینک' بنا اور اسی سال او۔آئی۔سی کے تحت 'اسلامی ترقیاتی بینک' کی بنیاد رکھی گئی۔1983ء میں 'اسلامی بینک بنگلہ دیش' کا قیام عمل میں آیا اور پھر اس کے بعد پوری دنیا میں اسلامی بینکوں کے قیام کی ایک دوڑ کا آغاز ہو گیا۔'اسلامی معاشیات' کے مصنفین نے اپنی کتاب میں دنیا کے 51 مسلم اور غیر مسلم ممالک میں تقریباً دو سو ساٹھ اسلامی بینکوں کے نام دیے ہیں کہ جن کی تعداد میں تاحال بہت حد تک پاکستان اور دوسرے ممالک میں مزید اضافہ بھی ہو چکا ہے۔پاکستان میں کئی ایک غیر سودی بینک کام کر رہے ہیں جن میں 'بینک اسلامی'، 'دوبئی اسلامی بینک'، 'داؤد اسلامک بینک'، 'میزان بینک' اور وغیرہ شامل ہیں۔

---

[1] مودودی، ابو الاعلی، سید، سود، (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، مئی 1987ء): 129۔141۔

مروجہ غیر سودی بینکوں کے ساتھ کاروبار کرنا

مروّجہ غیر سودی بینکوں کے ساتھ تعاون واشتراک کے بارے میں معاصر اہل علم تین گروہوں میں منقسم ہیں:

پہلا گروہ

اہل علم کی ایک جماعت ایسی ہے جو مروجہ غیر سودی بینکاری کو نہ صرف جائز سمجھتی ہے بلکہ ان کی اکثریت متنوع بینکوں کے شریعہ ایڈوائزر کی حیثیت سے اس نظام کا ایک حصہ بھی ہیں۔ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس گروہ کے سرپرست ہیں اور انہوں نے "An Introduction to Islamic Finance" کے نام سے کتاب لکھ کر غیر سودی بینکاری کی بنیادوں کو واضح کیا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ بعد ازاں مولانا محمد زاہد صاحب نے 'اسلامی بینکاری کی بنیادیں' کے نام سے کیا ہے۔ مروجہ غیر سودی بینکاری پر جب معاصر اہل علم کی مخالف رائے سامنے آئی کہ جس میں اس پورے نظام کو حیلہ سازی اور ناجائز کہا گیا تو مفتی تقی عثمانی صاحب نے غیر سودی بینکاری کے دفاع میں 'غیر سودی بینکاری: متعلقہ فقہی مسائل کی تحقیق اور اشکالات کا جائزہ' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ مفتی صاحب کے جامعہ، دار العلوم کراچی میں "Centre for Islamic Economics" کے تحت "An authentic Institute of Islamic Banking and Insurance" کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم ہے جو ان زیر نگرانی غیر سودی بینکاری میں کئی ایک کورسز کروا رہا ہے۔ مفتی تقی عثمانی صاحب کے بیٹے مولانا اشرف عثمانی صاحب نے بھی "Meezan Bank's Guide to Islamic Banking" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اسی طرح جامعہ دار العلوم کراچی کے مفتی اعجاز احمد صمدانی صاحب نے بھی 'اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ کا طریق کار' کے نام سے غیر سودی بینکاری کے جواز اور 'اسلامی بینکاری ایک حقیقت پسندانہ جائزہ' کے نام سے اس کے دفاع میں کتاب تالیف کی ہے۔ انہوں نے 'تکافل: انشورنس کا اسلامی طریقہ' کے نام سے بھی ایک کتاب مرتب کی ہے۔ اس گروہ کے مطابق اسلامی بینکاری اپنے مقاصد اور پریکٹس دونوں میں درست ہے اگرچہ اس کے مروجہ طریقہ کار کو آئیڈیل قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اس قدر اسلامی ضرور ہے کہ اس سے حاصل شدہ کمائی حلال ہے۔

دوسرا گروہ

اہل علم کی دوسری جماعت کا کہنا یہ ہے کہ مروجہ اسلامی بینکاری فقہی اور قانونی اعتبار سے ناجائز یا حرام ہے، اور ایسے غیر شرعی حیلوں پر مشتمل ہے جو اسے سودی بینکاری کے مترادف یا اس سے بھی بڑھ کر حرمت کے درجے میں لے جاتے ہیں۔ رئیس وفاق المدارس العربیہ شیخ سلیم اللہ خان صاحب کی سرپرستی میں 28 اگست 2008ء کو جامعہ فاروقیہ کراچی میں ملک بھر کے ارباب فتاوی کا دوروزہ اجلاس منعقد ہوا کہ جس میں انہوں نے ایک فتوی کے ذریعے مروجہ اسلامی بینکاری کو اتفاقی طور ناجائز قرار دیا۔ بعد ازاں جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی کے دار الافتاء نے 'مروجہ اسلامی بینکاری: تجزیاتی مطالعہ، شرعی جائزہ، نقد و تبصرہ' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے کہ جس میں اسلامی بینکاری کی فقہی و قانونی بنیادوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ جامعہ مدنیہ لاہور کے مفتی ڈاکٹر عبد الواحد صاحب نے بھی نے 'مروجہ اسلامی بینکاری کی چند خرابیاں' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے کہ جس میں مفتی تقی عثمانی صاحب اور ان کے بیٹے ڈاکٹر اشرف عثمانی صاحب کے معاشی نظریات پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ ابو ہریرہ اکیڈمی لاہور کے شیخ الحدیث ذوالفقار علی صاحب کی دو کتابیں 'دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم' اور 'معیشت و تجارت کے اسلامی احکام' بھی اسلامی بینکاری پر کتاب و سنت اور فقہاء کے مذاہب کی روشنی میں ہونے والی علمی تنقیدات میں نمایاں کردار رکھتی ہیں۔ اس گروہ کے مطابق اسلامی بینکاری وقت کی ایک اہم ضرورت ہے لیکن اس کا طریقہ کار غلط ہے۔ لہٰذا یہ اہل علم عموماً مروجہ اسلامی بینکاری کے نظام اور طریقہ کار کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں اور اس بارے حیلہ سازی اور فقہی موشگافیوں کا علمی محاکمہ کرتے نظر آتے ہیں۔

تیسرا گروہ

تیسرا گروہ ان اہل علم کا ہے جو اسلامی بینکاری کو سرے ہی سے ناجائز اور ناقابل عمل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی بینکاری اپنے مقاصد اور پریکٹس دونوں اعتبار سے ایک غیر اسلامی شیء ہے اور اس کی اسلامیت ناممکن امر ہے۔ اس نقطہ نظر کے سرپرست معروف ماہر معاشیات جناب جاوید اکبر انصاری ہیں۔ ان کے ایک شاگرد فاسٹ یونیورسٹی کے استاذ زاہد صدیق مغل صاحب نے 'اسلامی بینکاری و جمہوریت۔ فکری پس منظر اور تنقیدی جائزہ' کے نام سے اس نقطہ نظر کے حق میں ایک کتاب بھی تالیف کی ہے۔ یہ اہل علم اسلامی بینکاری پر جزوی یا فقہی تنقید کی بجائے اسے کلی اقتصادیات (macro economics)، مغربی معاشی تصورات، عالمی سرمایہ

دارانہ نظام (capitalism) اور شریعت اسلامیہ کے مقاصد کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

مروجہ اسلامی بینکاری: قانونی و فقہی جائزہ

ایک سودی بینک لوگوں سے ان کی رقوم امانت یا قرضے کے طور پر وصول کرتا ہے اور پھر اس کا ایک بڑا حصہ آگے سودی قرضوں میں جاری کر دیتا ہے اور اس جاری کردہ قرضے سے حاصل شدہ سود کا ایک حصہ اپنے کھاتے داروں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

اس کے بالمقابل ایک اسلامی بینک لوگوں سے ان کی رقوم مضاربہ (کاروبار کی ایک شکل) کے طور پر وصول کرتا ہے اور اس رقم کا ایک بڑا حصہ اِجارہ واقتناع یعنی گاڑیوں کی لیزنگ و فروخت یا مشارکۃ متناقصۃ یعنی ہاؤس فنانسنگ یا بیع مرابحۃ میں لگا دیتا ہے اور اس کاروبار سے حاصل شدہ نفع کا ایک متعین فی صد اپنے ان کھاتے داروں میں تقسیم کر دیتا ہے کہ جنہوں نے بچت اکاؤنٹ' سیونگ اکاؤنٹ' کاروباری منافع اکاؤنٹ' آمدن سرٹیفکیٹ' مضاربہ سرٹیفکیٹ اور سرٹیفکیٹ آف اسلامک انویسٹمنٹ وغیرہ جیسی سکیموں میں بینک میں اپنی رقوم جمع کروائی ہوتی ہیں۔ ان بچت سکیموں اور سرٹیفکیٹس سے حاصل شدہ نفع جائز ہے یا ناجائز؟ اس کا تعین اس بات سے ہو گا کہ بینک اپنے کھاتے داروں سے حاصل ہونے والے اس رقم کو انویسٹ (invest) کہاں کرتا ہے؟

ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ ایک اسلامی بینک اپنی جمع شدہ رقوم کا بڑا حصہ اِجارہ واقتناع' مشارکۃ متناقصۃ اور بیع مرابحۃ میں لگاتا ہے۔ اب ہم اسلامی بینک کے کاروبار کی ان شکلوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ کریں گے۔

اسلامی بینکوں کے کاروبار کی مختلف صورتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی بینکوں نے اپنے کاروبار کی بیشتر صورتوں میں ایک ناجائز چیز کو جائز بنانے کے لیے ناجائز حیلوں کا رستہ اختیار کیا ہے۔ اور اس قسم کے حیلوں سے ناجائز' جائز نہیں بن جاتا۔ شرعی احکام سے بچنے کے لیے اور ناجائز کو جائز بنانے کے لیے اس قسم کے حیلے کرنا شرعاً ممنوع ہے۔

قرآن کے بیان کے مطابق ساحل سمندر پر واقع یہود کی ایک بستی پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہفتے کے دن مچھلیوں کا شکار کرنے سے منع کیا تھا تا کہ وہ اس دن میں اللہ کی عبادت کریں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش میں اس طرح ڈالا کہ ہفتے والے دن تو مچھلیاں پانی کی سطح پر آ جاتی تھیں اور بستی والوں کو شکار کی دعوت دیتی تھیں جبکہ باقی دنوں میں گہرے پانی میں چلی جاتی تھیں۔ یہود کا ایک گروہ اس آزمائش میں پورا نہ اترا اور اس نے ہفتے کے

دن مچھلیاں پکڑنے کے لیے ایک حیلہ ایجاد کیا۔ انہوں نے سمندر کے ساحل کے نزدیک چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود ڈالے اور ان گڑھوں کو پانی کی نالیوں کے ذریعے سمندر سے ملا دیا۔ جب ہفتے کا دن ہوتا تو یہ گروہ مچھلیوں کو سمندر سے ان گڑھوں کی طرف ہانک دیتے تھے اور اتوار والے دن جا کر انہیں پکڑ لیتے تھے۔ اس طرح بظاہر وہ اللہ کے حکم کی پابندی کر رہے تھے کہ انہوں نے ہفتے والے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کیا لیکن اللہ کے اس حکم کا جو مقصود تھا یعنی ہفتے والے دن کو اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص کرنا، وہ یہاں پورا نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے گروہ نے اس پہلے گروہ کو حیلہ کرنے سے منع کیا لیکن پہلا گروہ نہ مانا۔ ایک تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو دوسرے گروہ کو کہتے تھے کہ پہلے گروہ کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے یہ لوگ نہ تو پہلے گروہ والوں کی طرح حیلے سے مچھلیاں پکڑتے تھے اور نہ ہی ان کو اس فعلِ بد سے منع کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے شرعی حکم سے بچنے کے لیے کیے جانے والے اس حیلے کی وجہ سے پہلے گروہ پر عذاب نازل کیا جس کا تذکرہ قرآن میں ان الفاظ میں موجود ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَأْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَأْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ۝وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾[1]

"اور آپ ان یہود سے اس بستی والوں کا حال پوچھیں جو سمندر کے کنارے آباد تھی جبکہ وہ لوگ ہفتے کے دن زیادتی کرتے تھے جب ان کے پاس ان کی مچھلیاں ان کے ہفتے والے دن پانی کی سطح پر آ جاتی تھیں اور جس دن ہفتہ نہ ہوتا تھا تو وہ ان کے سامنے نہ آتی تھیں۔ اسی طرح ہم ان کی آزمائش کر رہے تھے اس وجہ سے کہ وہ نافرمان تھے۔ جب اس بستی کے ایک گروہ نے دوسرے

[1] سورة الأعراف، 7: 163۔ 165۔

سے کہا کہ تم اس جماعت کو کیوں نصیحت کرتے ہو کہ جس کو اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے تو انہوں نے کہا: تا کہ تمہارے رب کے ہاں معذرت پیش کر سکیں کہ ہم نے تو انہیں سمجھایا تھا۔ اور شاید ان میں سے کچھ لوگ ڈر جائیں۔ پس جب انہوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا کہ جس کی ان کو نصیحت کرائی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو کہ برائی سے منع کرتے تھے اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ہم نے ان کو ان کی نافرمانی کے سبب سخت عذاب میں پکڑ لیا۔"

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((قَاتَلَ الله اليَهُودَ حُرِّمَتْ عَلَيْهِمُ الشُّحُومُ، فَجَمَلُوهَا فَبَاعُوهَا)) [1]

"اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے، ان پر چربی کا کھانا حرام کیا گیا تو انہوں نے اس کو پگھلا کر بیچ ڈالا (اور بیچ کر اس کی قیمت کھانے لگ گئے)۔"

فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایسے تمام حیلوں کو اختیار کرنا کہ جن سے شرعی احکام باطل ہو جاتے ہوں یا ناجائز کو جائز بنایا جاتا ہو، ناجائز ہے۔[2] مثلاً اگر کسی شخص کے پاس دس لاکھ روپیہ گیارہ ماہ سے پڑا ہے اور اب وہ شخص زکوۃ سے بچنے کے لیے سال گزرنے سے ایک دو ہفتے پہلے وہی مال اپنی بیوی کو ہبہ کر دیتا ہے تو اب اس پر زکوۃ نہ ہو گی کیونکہ اس رقم پر ایک مکمل سال نہیں گزرا۔ اسی طرح اگلے سال اس کی بیوی سال گزرنے سے پہلے یہی رقم اپنے شوہر کو ہبہ کر دیتی ہے اور اس طرح وہ مال پھر زکوۃ سے بچ جاتا ہے۔

حیلوں کی بعض صورتیں ایسی ہیں کہ جن میں بظاہر کوئی فرض یا واجب حکم ساقط تو نہیں ہوتا ہے لیکن اس حکم سے مطلوب شرعی مقاصد پورے نہیں ہوتے ہیں۔ اس قسم کے حیلوں کی ایک صورت جو عام طور پر رائج ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص زکوۃ سے بچنے کے لیے کسی ایسے شخص کو تلاش کرتا ہے جو زکوۃ کا مستحق ہو۔ اب اس شخص کو زکوۃ کی رقم دینے سے پہلے وہ صاحب یہ طے کرتا ہے کہ وہ شخص یہ زکوۃ لینے کے بعد اس رقم کا ایک معمولی سا حصہ اپنے پاس رکھے گا اور باقی رقم زکوۃ دینے والے کو ہبہ کر دے گا۔ لہٰذا اگر کسی شخص کی زکوۃ 50 ہزار بنتی ہے تو مستحق زکوۃ شخص وہ زکوۃ وصول کرنے کے بعد اس میں سے 2 یا 3 ہزار خود رکھ لیتا ہے اور باقی رقم زکوۃ دینے

---

[1] البخاري، أبو عبد الله محمد بن إسماعيل، الصحيح البخاري، كتاب البيوع، باب لا يذاب شحم الميتة ولا يباع ودكه، (الرياض: دار السلام للنشر والتوزيع، الطبعة الثانية، 1999ء)، رقم: 2223۔

[2] احمد حسن، ڈاکٹر، جامع الاصول، شریعہ اکیڈمی، (اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی): 416۔418۔

والے کو ہبہ کر دیتا ہے۔

اس طرح کے حیلے کے نتیجے میں زکوۃ کے حکم کا جو شرعی مقصد تھا یعنی غربا، مساکین اور محتاجوں کی امداد یا صاحب مال کا تزکیہ نفس وغیرہ، تو وہ فوت ہو جاتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت تھی کہ زکوۃ کسی بستی کے امراء سے وصول کی جائے اور اسی بستی کے غریبوں کی طرف لوٹا دی جائے۔[1] اگر کوئی عالم ایسے حیلے اختیار کرے کہ جن سے وہ زکوۃ دوبارہ امراء کی طرف واپس لوٹ جائے تو یہ حیلے شرعاً ناجائز ہوں گے۔ اور ان حیلوں کی ممانعت نصوص شریعہ سے ثابت ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر احمد حسن لکھتے ہیں:

> "تمام فقہاء کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ شرعی احکام کے ابطال کے لیے حیلوں کا استعمال ناجائز ہے۔ احناف کے ہاں ہمیں حیلوں کے استعمال کا جواز ملتا ہے۔ امام محمد بن الحسن کی طرف اس موضوع پر ایک کتاب بھی منسوب ہے۔ اور خصاف کی حیل پر ایک کتاب ہے۔ ان حیلوں سے فقہائے احناف کی مراد وہ حیلے نہیں ہیں جن سے شرعی احکام باطل ہو جاتے ہیں' اور وہ مصالح فوت ہو جاتی ہیں جن کے لیے یہ احکام دیے گئے ہیں۔ بلکہ ان حیلوں سے مقصود وہ راستے اور وہ وسیلے تلاش کرنا ہے جن سے یہ مصالح پورے ہوں' نہ کہ شرعی احکام کی خلاف ورزی ہو۔"[2]

متقدمین کا حیلوں کے بارے میں موقف یہی تھا لیکن متاخرین نے حیلوں کے بارے میں نرم رویہ اختیار کیا۔ راقم الحروف، لاہور کے ایک جامعہ میں طالب علم تھا تو ایک دفعہ ایک دوست نے حج کے ایک مسئلے کے بارے دریافت فرمایا کہ اس کا شرعی حکم جامعہ کے دار الافتاء سے پوچھ کر آنا ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ کسی شخص کی کمائی صریحاً حرام سے تھی اور وہ شخص اپنے اس حرام مال سے اپنے والد صاحب کو حج پر بھیجنا چاہتا تھا جبکہ والد صاحب اس پر راضی نہ تھے۔ راقم الحروف نے دارالافتاء میں موجود مفتی صاحبان سے اس مسئلے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فوراً فقہ کی کسی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ حرام کی کمائی سے حج نہیں ہوتا لہٰذا اس کے والد کے لیے حج پر جانا جائز نہیں ہے۔ یہ جواب حاصل کر کے ابھی کھڑا ہی ہوا تھا کہ مفتی صاحب کہنے لگے ایک حیلہ بھی بتا دوں۔ میں نے کہا: بتا دیں۔ تو وہ فرمانے لگے کہ سائل کے والد صاحب سے کہیں کہ کسی سے قرض لے کر حج پر

---

[1] الترمذی، أبو عیسی محمد بن عیسی، سنن الترمذی، کتاب الزکاۃ عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء أن الصدقۃ تؤخذ من الأغنیاء فترد علی الفقراء، (الریاض: دار السلام للنشر والتوزیع، 2008ء)، رقم: 649۔

[2] جامع الاصول: 410۔

چلیں جائیں اور اس قرض کی ادائیگی ان کا بیٹا کر دے۔

اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ اسلامی بینکاری کے قائلین کی اصل بنیاد کو واضح کیا جا سکے۔ چونکہ متاخرین میں حیلوں کے استعمال کا ایک پورا باب ہے اور ان حیلوں کو بالعموم استعمال بھی کیا جاتا ہے لہذا لوگوں کے معاشی مسائل حل کرنے کے لیے بھی ان حیلوں کو استعمال کیا گیا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ ایک ایسا حیلہ کہ جس سے کوئی شرعی فرض ساقط ہو جائے یا کوئی حرام' حلال بن جائے وہ فقہاء کے نزدیک ناجائز حیلہ ہے' لیکن متاخرین کے ہاں بہت سے ایسے حیلوں کو جائز رکھا گیا ہے کہ جن سے احکام الٰہی کے شرعی مقاصد فوت ہو جاتے ہوں اور اسلامی بینکاری کی بنیاد اسی قسم کے حیلوں پر ہے۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک حیلوں سے استدلال کی اس اصولی بنیاد کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ نہ لیا جائے گا اس وقت تک اسلامی بینکاری کے بارے میں کوئی قابل قدر تحقیق پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔

اسلامی بینکاری کے بعض قائلین کی طرف سے بعض ایسی نصوص پیش کی جاتی ہیں کہ جن سے اس قسم کے حیلوں کو جائز قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت ایوب کا اپنی بیوی کو سو کوڑوں کی جگہ جھاڑو مارنا[1] یا حضرت یوسف کا اپنے بھائی کو حیلے بہانے سے رکھ لینا[2] یا حضرت بلال کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا کہ ردی کھجور کے بدلے عمدہ کھجور کمی بیشی کے ساتھ نہ بیچو بلکہ اگر ایسا کرنا ہی ہو تو پہلے اپنی ردی کھجور بیچو اور پھر عمدہ کھجور خریدو۔[3] یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بوڑھے بیمار شخص پر زنا کی حد جاری کرنے کے لیے یہ حکم دینا کہ اس کو سو کوڑوں کی بجائے سو شاخوں والی کھجور کی ایک ٹہنی مار دو۔[4]

ایسی تمام مثالوں کا جواب یہ ہے کہ اگر تو اپنے حق کو حاصل کرنے یا کسی ظلم کو رفع کرنے کے لیے یا کسی شخص سے ایسی تکلیف دور کرنے کے لیے ہو جو تکلیف ما لا یطاق میں داخل ہو، حیلہ کیا جائے تو یہ ایک جائز حیلہ ہے بشرطیکہ اس حیلے کے لیے جائز ذریعہ یا وسیلہ استعمال کیا جائے اور بعض علما مثلاً امام شاطبی رحمہ اللہ (متوفیٰ

---

1 سورة ص،38: 44۔

2 سورة يوسف،12: 70۔76۔

3 صحيح البخاري،كتاب الوكالة،باب إذا باع الوكيل شيئا فاسدا فبيعه مردود،رقم: 2312۔

4 أبوداؤد سليمان بن أشعث السجستاني،سنن أبي داؤد،كتاب الحدود،باب إقامة الحد على المريض،(الرياض: دار السلام للنشر والتوزيع،الطبعة الأولى،1999ء)،رقم: 4479۔

590ھ)وغیرہ تو اسے حیلے کی تعریف میں بھی داخل نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک حیلہ وہی ہے جو ناجائز اور غیر شرعی حیلہ ہو۔ اس کے برعکس بعض علما مثلاً امام ابن القیم رحمہ اللہ (متوفیٰ 751)وغیرہ نے حیلے کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک جائز اور شرعی حیلہ ہے اور دوسرا ناجائز اور غیر شرعی حیلہ۔[1]

حضرت ایوب نے ایک دفعہ اپنی بیوی کی ناشکری پر یہ قسم اٹھائی کہ صحت مند ہونے کے بعد تمہیں سو کوڑے ماروں گا۔ حضرت ایوب کی بیوی کا جرم ایسا نہ تھا کہ ان پر سو کوڑوں کی سزا جاری کی جاتی لیکن حضرت ایوب کو اپنی قسم کا بھی لحاظ تھا لہٰذا حضرت ایوب کی بیوی کو ایک ایسی سزا سے بچانے کے لیے کہ جس کی وہ سزاوار نہ تھیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک حیلہ سجھا دیا۔ لہٰذا ایسا حیلہ جو دفع ضرر کے لیے ہو جائز حیلہ ہے۔ اسی طرح حضرت یوسف کا اپنے بھائی کو اپنے پاس روکنا، ان کا ایک شرعی و اخلاقی حق تھا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے بھائی بنیامین کو سوتیلے بھائیوں کے مزید ظلم سے بچانا چاہتے تھے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ اِنِّیْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾[2]

"انہوں نے کہا کہ میں آپ کا بھائی ہوں۔ پس آپ غم نہ کریں اس پر جو کہ وہ کرتے تھے"

علاوہ ازیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے اور بیمار شخص پر سو کوڑوں کی حد اس لیے جاری نہ فرمائی کہ اس کے جاری کرنے سے اس کے مرنے کا امکان غالب تھا، پس اسے تکلیف مالا یطاق سے بچانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حیلہ اختیار فرمایا۔ حضرت بلال والی روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ذاتی ضرورت پوری کرنے کے لیے، ایک جائز ذریعے اور وسیلے کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی ہے یعنی بیع کے عام مروج طریقے کے ذریعے پہلے اپنی ردی کھجور بیچو اور پھر عمدہ کھجور حاصل کرو۔ یہاں ردی کھجور کے بدلے عمدہ کھجور کے حصول کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیع کے سادہ اور روزمرہ کے ایک جائز طریقے کو استعمال کرنے کی ترغیب دلا رہے ہیں نہ کہ کسی ناجائز کو جائز بنانے کے کسی ناجائز حیلے کو اختیار کرنے کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اس کو اگر حیلہ کہا بھی جائے تو اس حیلے سے شریعت کا کوئی مقصد یا مصلحت فوت نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی شرعی حکم باطل ٹھہرتا ہے جبکہ اسلامی بینک جن حیلوں کی بنیاد پر قائم ہیں وہ شرعی مقاصد و مصالح کو فوت کرنے کے ساتھ ساتھ

---

[1] جامع الأصول: 423۔425۔

[2] سورة يوسف: 12: 69۔

شرعی احکام کو باطل کرنے والے بھی ہیں۔ ان حیلوں پر اگر غور کیا جائے تو یہ ناجائز کو جائز بنانے کے ویسے ہی چور دروازے ہیں جو یہود نے استعمال کیے تھے۔

حال ہی میں مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علمائے احناف کی ایک بڑی تعداد کا ایک متفقہ فتوی کراچی سے جاری ہوا ہے' جس میں مرقوم ہے:

> ''مروجہ اسلامی بینکاری کی غیر اصلی اور عارضی بنیادیں چونکہ مرابحہ و اجارہ ہیں۔ ان عارضی بنیادوں پر بینکاری کرنے کو اور ان عارضی حیلوں کو مستقل ذریعہ تمویل بنانے کو اسلامی بینکاری کہنا اور سمجھنا شرعاً و اخلاقاً جائز کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس کی چند وجوہات یہ ہیں:
>
> 1۔ غیر اصلی بنیادیں (مرابحہ و اجارہ) محض حیلے ہیں اور حیلوں کو مستقل نظام بنانا ناجائز ہے' ایسے حیلوں کے ذریعے انجام پانے والا معاملہ بھی ناجائز ہی کہلاتا ہے۔ جیسے امام محمد رحمہ اللہ (متوفیٰ 189ھ) کے ہاں 'بیع عینہ' کا حیلہ ناجائز ہے اسی طرح مرابحہ و اجارہ کے حیلے اور ان کو ذریعہ تمویل بنانا بھی ناجائز ہے....
>
> 2۔ یہ حیلے صرف مخصوص حالات اور وقتی عبوری دور کے لیے علما نے بنائے تھے۔
>
> 3۔ یہ بہت ہی نازک اور خطرناک حیلے ہیں' ذراسی بے احتیاطی اس کو سودی نظام سے ملا دیتی ہے۔
>
> 4۔ ان حیلوں کو دائمی نظام کے طور پر استعمال کرنا نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ ناجائز بھی ہے۔
>
> 5۔ اسلامی بینکاری میں مرابحہ اور اجارہ کا حجم ختم ہونا ضروری ہے' ورنہ کوئی اسلامی بینک ''اسلامی بینک'' کہلانے کا حقدار نہیں ہو گا بلکہ ''حیلہ بینک'' کہلانے کا بجا طور پر حقدار ہو گا۔''[1]

آٹھ صفحات پر مشتمل اس مفصل فتوے کی بعد میں پریس ریلیز بھی جاری کی گئی، جبکہ فتویٰ ایک پمفلٹ کی صورت میں عام کیا گیا اور اس کے ناشر کا نام موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ فتوی معروف انگریزی روزنامہ اخبار 'ڈیلی نیوز' کے 29 اگست 2008ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے اور اس کا خلاصہ جامعہ بنوری ٹاؤن کی ویب سائیٹ پر بھی

[1] مجموعۃ من علماء دیوبند، مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علماء کرام اور مفتیان عظام کا متفقہ فتوی: 3۔4؛28 اگست 2008ء کو جامعہ فاروقیہ، شاہ فیصل کالونی، کراچی میں مولانا سلیم اللہ خان صاحب کی زیر صدارت پاکستان کے چاروں صوبوں سے معروف حنفی اہل علم اور ارباب فتاوی کا مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے ایک مشاورتی اجلاس منعقد ہوا جس کے نتیجے میں اسلامی بینکاری کے بارے ایک اجتماعی فتوی جاری کیا گیا اور اس کی فوٹو کاپیاں کثیر تعداد میں تقسیم ہوئیں۔ اس اجتماعی فتوی پر مطبع یا سن اشاعت وغیرہ درج نہیں ہے۔

موجود ہے۔ اس میں یہ کہا گیا کہ مروجہ اسلامی بینکاری قطعی غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے۔اسلام کی طرف منسوب بینکوں کا بھی وہی حکم ہے جو دیگر سودی بینکوں کا ہے۔اس اجلاس میں جامعہ اشرفیہ لاہور سے حضرت مفتی حمید اللہ جان صاحب، جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی سے حضرت مولانا مفتی عبدالمجید دین پوری صاحب، حضرت مولانا مفتی رفیق احمد صاحب اور حضرت مولانا مفتی شعیب عالم صاحب، جامعہ فاروقیہ سے حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب، مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب، حضرت مولانا مفتی سمیع اللہ صاحب، حضرت مولانا مفتی احمد خان صاحب، جامعہ اسلامیہ کلفٹن سے حضرت مفتی حبیب اللہ شیخ صاحب، خیر المدارس ملتان سے مفتی مولانا عبد اللہ صاحب، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے حضرت مفتی غلام قادر صاحب، جامعہ خلفائے راشدین کراچی سے حضرت مفتی احمد ممتاز صاحب، جامعہ احسن العلوم کراچی سے حضرت مفتی زرولی خان صاحب، جامعہ رشیدیہ بلوچستان سے حضرت مولانا مفتی احتشام الحق آسیا آبادی صاحب وغیرہ نے شرکت کی ہے۔

اس اصولی وضاحت کے بعد ذیل میں ہم اسلامی بینکوں کے کاروبار کی معروف ورائج شکلوں کا کسی قدر تفصیلی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

مشارکۃ متناقص(Deminishing Musrakah)

کاروبار کی اس صورت میں ایک شخص مثلاً زید، اسلامی بینک کے پاس جاتا ہے اور بینک سے کہتا ہے کہ مجھے ایک مکان چاہیے اور میرے پاس اس مکان کے بنانے یا خریدنے کے لیے رقم موجود نہیں ہے۔اسلامی بینک زید سے کہتا ہے کہ تم میرے ساتھ مل کر کوئی مکان بنالو یا خریدلو۔

فرض کریں اب بینک اور زید مل کر ایک مشترکہ مکان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔بینک یہ ذمہ داری اٹھاتا ہے کہ وہ اس مکان کا 80 فی صد خرچہ اٹھائے گا جبکہ زید اس میں 20 فی صد رقم لگاتا ہے۔مکان بنوانے کے لیے ساری بھاگ دوڑ زید کو کرنی پڑتی ہے زید ہی مکان اپنی نگرانی میں بنواتا ہے کیونکہ اسی نے اس میں رہنا ہے۔بینک زید کو مکان کی صرف 80 فی صد رقم مہیا کرتا ہے اور مکان بنوانے میں عملاً شریک نہیں ہوتا۔مکان بننے کے بعد جب زید اس مکان میں رہائش پذیر ہوتا ہے تو بینک زید سے کہتا ہے کہ مجھے اس مکان کے 80 فی صد حصے کا کرایہ ادا کرو، کیونکہ تم اس مکان کو استعمال بھی کر رہے ہو۔زید بینک کو اس کے حصے کے مطابق کا کرایہ ادا کرتا ہے اور ساتھ ساتھ مکان میں بینک کا حصہ بھی اس سے قسطوں پر خریدتا رہتا ہے۔زید کی طرف سے قسطوں کی ادائیگی

کے ساتھ مکان میں بینک کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے اور اسی حساب سے بینک کا کرایہ بھی کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ بالآخر زید بینک سے آہستہ آہستہ اس کا تمام حصہ خرید لیتا ہے۔ اس صورت میں زید مکان کی قسط الگ اور کرایہ الگ طور پر ادا کر رہا ہوتا ہے۔

مشارکہ متناقصہ پر کیے جانے والے اعتراضات

مختلف علمی حلقوں' اسلامی بینکوں میں ملازمت کرنے والے افراد اور ماہرین معاشیات کی طرف سے اسلامی بینک کے اس کاروبار پر درج ذیل اعتراضات کیے جاتے ہیں:

پہلا اعتراض: اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ ایک اسلامی بینک زید سے کرایہ اس وقت وصول کرتا ہے جبکہ وہ گھر تیار ہو جاتا ہے اور زید اس میں رہنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن جب کہ مکان ابھی بن رہا ہوتا ہے اور بینک اس مکان کے بننے کے لیے زید کو رقم فراہم کرتا ہے تو بینک اس دن سے ہی کرایہ کا حساب کتاب (caculation) شروع کر دیتا ہے جس دن سے اس نے زید کو پہلی دفعہ رقم کا ایک حصہ دیا ہوتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ عموماً بینک زید کو مکان کی تعمیر کے لیے اکٹھی رقم نہیں دیتا بلکہ وقفے وقفے سے دیتا ہے۔

مثال کے طور پر زید نے 50 لاکھ کا ایک مکان بنوانا ہے۔ جس میں 40 لاکھ بینک ڈالتا ہے اور دس لاکھ زید کے ہیں۔ اب زید جب گھر کی تعمیر شروع کرتا ہے تو بینک زید کو دس لاکھ دیتا ہے تو جس دن سے بینک نے یہ رقم دی ہے اس نے زید سے اسی دن سے اس دس لاکھ کا کرایہ لینا شروع کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر دو ماہ بعد بینک نے زید کو پھر دس لاکھ کی رقم دی تو اب بینک زید سے 20 لاکھ کا کرایہ وصول کرنا شروع کر دے گا۔ اور چار ماہ بعد اگر بینک نے زید کو مزید دس لاکھ دیئے تو اب بینک زید سے تیس لاکھ کا کرایہ وصول کرنا شروع کر دے گا اور صورت حال یہ ہے کہ مکان ابھی تعمیر ہو رہا ہے اور زید نے اس مکان کو استعمال بھی نہیں کیا ہے اور بنک اس کا کرایہ لگا رہا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں بینک زید سے ایک ایسے مکان کا کرایہ وصول کر رہا ہے کہ جس کی صرف دیواریں کھڑی ہیں اور چھت موجود نہیں ہے۔ یہ واضح رہے کہ بینک مکان کی تعمیر کے اس سارے عرصے میں زید سے بالفعل کرایہ نہیں لیتا اور نہ ہی زید کو یہ بتلاتا ہے کہ میں تم سے اس دورانیے کا بھی کرایہ لے رہا ہوں بلکہ بینک یہ کرایہ اپنے کاغذوں میں لکھ لیتا ہے اور جب زید اس گھر کی تعمیر کے بعد اس میں رہائش پذیر ہو گا تو بینک اس تعمیر شدہ مکان کا کرایہ مارکیٹ ریٹ (market rate) کی بجائے اس طرح وصول کرے گا کہ اس نے مکان کی تعمیر کے مہینوں

کے کرایہ کو بھی، مکان کی تعمیر کے بعد زید سے وصول ہونے والے کرایہ میں شامل (adjust) کیا ہو گا۔

دوسرا اعتراض: اسلامی بینک مکان کے کرایہ وصول کرنے کا تعین سودی بینکوں کی شرح سود سے کرتا ہے۔ مفتی ڈاکٹر عبد الواحد صاحب لکھتے ہیں:

> "کسی شے کی قیمت یا کرایہ طے کرنے کے لیے مروجہ اسلامی بینک ایک متبادل ریٹ کا ذکر کرتے ہیں جس میں بنیادی اہمیت Kibor یعنی "karachi inter bank offered rate" کو حاصل ہوتی ہے جو کہ بینکوں کے آپس کے لین دین کی شرح سود ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس شرح سود کی بنیاد پر قیمت یا کرایے کا تعین کیا جاتا ہے اور اس کی تبدیلی سے قیمت یا کرایہ بدلتا رہے گا۔ اس میں دو خرابیاں ہیں: ا۔ قیمت یا کرایہ کے طے کرنے میں شرح سود کو معیار بنانے اور اس کو ذکر کرنے میں اسلام کے غیر سودی نظام سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔"[1]

مثال کے طور پر زید کے مکان کی تعمیر ایک سال میں ہوئی کہ جس میں 40 لاکھ بینک نے فراہم کیا تھا اور دس لاکھ زید کا تھا۔ اب مکان کی تعمیر کے دوران کے ایک سال کا بینک اگر کرایہ وصول کرتا ہے جبکہ مکان ابھی تک بنا ہی نہیں ہے اور زید نے مکان کو استعمال بھی نہیں کیا تو در حقیقت یہ کرایہ نہیں ہے بلکہ بینک زید سے مشارکت (partnership) کے نام پر اپنی فراہم کردہ رقم پر سود (intrest) وصول کر رہا ہے۔

یہ بات بہت واضح تھی کہ بینک زید سے مکان کی تعمیر کے دوران کرایہ وصول نہیں کر سکتا، لہٰذا یہاں اس نے ایک حیلہ کیا اور وہ یہ کہ زید سے مکان کی تعمیر کے دوران کرایہ تو نہ لیا لیکن اس کو سودی بینکوں کی شرح سود کے مطابق حساب (calculate) کر کے اپنے کاغذوں میں لکھ لیا اور مکان کی تعمیر کے بعد زید سے وصول ہونے والے کرایے میں اس کرایے کو بھی شامل (adjust) کر دیا، جس کی وجہ سے مکان کا کرایہ مارکیٹ ریٹ سے بہت مختلف ہو گیا۔ مثال کے طور پر ایک ہی علاقے مثلاً ڈیفنس (defense) میں ایک ہی جیسی قیمت کے ایک ایک کنال کے 50 گھر ہیں۔ اب 49 گھروں کے کرایہ کا انداز تو ایک جیسا ہو گا لیکن بینک کے ذریعے اس علاقے میں جو پچاسواں گھر بنایا گیا ہے اور بینک اس کا کرایہ جب وصول کرے گا تو وہ ان 49 گھروں کے کرایے سے بہت فرق ہو گا۔ کرایے کے اس فرق کو بیان کرنے سے مقصود یہ نہیں ہے کہ بینک کا کرایہ عام کرایے سے بہت زیادہ ہوتا

[1] عبد الواحد، مفتی، ڈاکٹر، مروجہ اسلامی بینکاری کی چند خرابیاں، ماہنامہ محدث، لاہور، ستمبر 2008ء، جلد 40، شمارہ 9: 29۔

ہے بلکہ یہ بعض صورتوں میں عام کرایے سے بہت زیادہ کم بھی ہو سکتا ہے۔ اس بحث سے اصل مقصود یہ ہے کہ بینک کے کرایہ کا معیار مارکیٹ نہیں بلکہ (KIBOR) ہوتا ہے۔

ایک اور بات جو اس شبہے کو مزید قوی کر دیتی ہے، یہ ہے کہ بینک جب بھی کسی ایسے مکان کے کرایے کا تعین کرتا ہے تو وہ اپنی کل لاگت (investment) کو سامنے رکھتا ہے مثلاً وہ چالیس لاکھ ہے تو بینک سودی بینکوں کی شرح سود (intrest rate) کو سامنے رکھتے ہوئے اس چالیس لاکھ کی رقم کا تیرہ یا چودہ فی صد سود نکالے گا اور پھر اس سود کو کرایے کا نام دے کر اپنے مشارک (partner) سے وصول کرلے گا۔

مثلاً بینک کا کسی شخص سے پانچ سال کا معاہدہ ہوا ہے کہ وہ شخص پانچ سال میں بینک کی 80 فی صد رقم مثلاً 40 لاکھ اس کو واپس لوٹا دے گا۔ اب بینک اپنے 40 لاکھ کو کئی ایک یونٹس (units) میں تقسیم کرے گا اور اپنی 40 لاکھ کی اصل رقم اس شخص سے پانچ سال میں قسطوں کی شکل میں واپس لے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ 40 لاکھ کا 13 یا 14 فی صد سود بینک کرایے کے نام سے وصول کرے گا اور جیسے جیسے قسطوں کی ادائیگی سے بینک کی اصل رقم کم ہوتی جائے گی مثلاً وہ 30 لاکھ یا 20 لاکھ ہو جاتی ہے تو اس کا 13 یا 14 فی صد سود بھی کم ہو گا لہٰذا بینک کرایہ بھی کم وصول کرے گا۔ سود (intrest) کو کاغذوں میں کرایہ (rent) لکھ دینے سے وہ کرایہ نہیں بن جاتا ہے۔ کرایہ تو اس صورت میں آپ اس کو کہیں جبکہ اس مکان کا کرایہ مارکیٹ ریٹ کے مطابق ہو نہ کہ بینکوں کی شرح سود پر اس کرایے کا تعین (calculation) کیا گیا ہو۔

تیسرا اعتراض: بینک اپنے پارٹنر (partner) سے 40 لاکھ وصول کرنے کے لیے اس کے چھوٹے چھوٹے یونٹس بنا لیتا ہے۔ مثلاً 40 لاکھ کی وصولی اگر بینک نے پانچ سالوں میں کرنی ہے تو وہ 40 لاکھ کو پانچ سالوں میں اس طرح تقسیم کر دے گا کہ اس کی وصولی قسطوں کی صورت میں بینک کو پانچ سال میں مکمل ہو جائے۔ اگر کوئی شخص بینک سے کسی موقع پر ایک سے زائد یونٹس خریدنا چاہتا ہے یا آسان الفاظ میں بینک کو ایک سے زائد اقساط ادا کرنا چاہتا ہے تو اس شخص کو ان اقساط کے مجموعے کا تین 3 فی صد زائد ادا کرنا ہو گا جو کہ صریحاً سود ہے۔

بینک ایک شخص سے چالیس لاکھ پانچ سالوں میں وصول کرنے کے لیے اس کی قسطیں بنا دیتا ہے، مثلاً یہ طے پاتا ہے کہ زید بینک کو پہلے تین ماہ میں دو لاکھ واپس کرے گا اور زید تین ماہ میں بینک کو دو لاکھ کی رقم واپس نہیں کر سکا تو بینک کو اس صورت میں بھی کوئی نقصان اس لیے نہیں ہے کہ زید کے ذمے زیادہ رقم واجب الاداء ہے جس

کی وجہ سے زید مکان کا کرایہ بھی زیادہ ادا کر رہا ہے۔

چوتھا اعتراض: بینک جب کسی شخص کے ساتھ مل کر ایک مکان بنانا شروع کرتا ہے تو اس مکان کی تعمیر سے پہلے ہی بینک اس شخص سے یہ معاہدہ کرلیتا ہے کہ مکان کی تعمیر کے بعد وہ شخص بینک سے وہ مکان کرائے پر لے گا اور کرایہ بھی بینک اسی وقت متعین کردیتا ہے۔ایک ایسا مکان جس کا وجود ہی نہیں ہے،اس کا کرایہ کیسے متعین کیا جاسکتا ہے؟اور وہ کرایہ بھی سودی بینکوں کی شرح سود کے مطابق ہوتا ہے نہ کہ مارکیٹ ریٹ کے مطابق۔

پانچواں اعتراض:اسی طرح ہوم فنانسنگ میں انشورنس یا تکافل (اسلامی انشورنس) کروانی پڑتی ہے جو ناجائز ہے۔مفتی ڈاکٹر عبد الواحد صاحب لکھتے ہیں:

> "اسلام کی رو سے انشورنس یقیناً ناجائز ہے اور اس میں سود، جوئے اور غرر کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔یہی تینوں باتیں تکافل یعنی اسلامی انشورنس میں بھی پائی جاتی ہیں۔جیسا کہ تکافل کے موضوع پر ہم مستقل لکھ چکے ہیں۔لہٰذا مروجہ تکافل بھی غیر اسلامی طریقہ کار ہے۔بینک اپنے ہی نام انشورنس کراتا ہے اور گھر میں بینک اور گاہک خود اپنے اپنے حصوں کے بقدر کراتے ہیں۔اس میں مندرجہ ذیل باتیں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں:ا۔گاہک جو کار لیزنگ یا ہوم فنانسنگ کرواتا ہے وہ بینک کے انشورنس یا تکافل میں مبتلا ہونے کا ایک سبب بنتا ہے اور اس کو علم ہے کہ بینک ایسا ضرور کرے گا اور محض اس کی وجہ سے کرے گا تو اس بنا پر وہ بھی گناہ گار ہوتا ہے۔"[1]

بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ ہاؤس فنانسنگ کے جواز کا سیدھا سادھا طریقہ یہ ہے کہ بینک اور زید نے مل کر مکان بنایا ہے جس میں بینک نے چالیس لاکھ لگائے ہیں اور زید نے دس لاکھ ڈالے ہیں۔مکان کی تعمیر کے بعد بینک اور زید دونوں اس مکان کو کسی تیسرے شخص کو کرایے پر دے دیں۔مثلاً تیسرا شخص اس مکان کا پچیس ہزار کرایہ دیتا ہے تو اب اس مکان کا بیس ہزار کرایہ بینک لے لے اور پانچ ہزار زید کو مل جائے گا۔اس کے علاوہ زید بینک کو اس کی رقم آسان قسطوں میں واپس بھی کرتا رہے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہاؤس فنانسنگ کی سکیموں میں اسلامی بینکوں نے کتاب الحیل کا سہارا لے کر سود کو کرایے کا نام دے دیا ہے جو کسی بھی صاحب شعور سے مخفی نہیں ہے۔اگر وہ کرایہ ہے تو وہ مارکیٹ ریٹ کے مطابق ہوتا یا اس

---

1 مروجہ اسلامی بینکاری کی چند خرابیاں:31۔

سے کچھ اوپر نیچے ہوتا۔ اگر وہ کرایہ ہے تو اس کرایے کا تعین کرتے وقت بینک مکان کی تعمیر کے مہینوں کو بھی اس کرایے میں شامل نہ کرتا۔ اگر وہ کرایہ ہے تو بینک اس کرایے کا تعین سودی بینکوں کی شرح سود کو سامنے رکھتے ہوئے نہ کرتا۔ اس کے لیے عام طور پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ شریعت میں کسی چیز کو کرایہ پر دینے یا فروخت کرنے کے لیے کوئی شرح متعین نہیں ہے لہٰذا بینک کو تو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس شرح سے چاہے' اپنے حصہ دار (partner) سے کرایہ وصول کرے۔

کرایے کے اس فرق کو بیان کرنے سے مقصود یہ نہیں ہے کہ بینک کا کرایہ عام کرایے سے بہت زیادہ ہوتا ہے، بلکہ یہ بعض صورتوں میں عام کرایے سے کم بھی ہو سکتا ہے۔ مقصود کلام یہ ہے کہ یہ در حقیقت کرایہ نہیں ہے بلکہ اس کو صرف کاغذوں میں کرایے کا نام دیا گیا ہے جیسا کہ ایک تھانے کو کاغذوں میں ہسپتال لکھ دیا جائے تو وہ ہسپتال نہیں بن جاتا ہے کیونکہ دونوں کا ڈھانچہ، بنیادی ضروریات اور ماحول بہت مختلف ہوتا ہے۔ گھر کا کرایہ عموماً اس کی لوکیشن (location)، اس کے ڈھانچے (structure) اس کی قیمت اور اس کے رقبے وغیرہ سے طے ہوتا ہے۔ مثلاً ایک گھر ڈیفنس میں ہے جو ایک کنال کا ہے اور ایک گھر رائے ونڈ روڈ پر ہے اور وہ بھی ایک کنال کا ہے تو دونوں کے کرایے میں واضح فرق ہو گا۔ اسی طرح ڈیفنس میں ہی پانچ مرلے اور ایک کنال کے گھر کے کرایہ کا فرق نمایاں ہو گا۔ شاہدرہ میں ایک ہی گلی میں ایک ایک کنال کے دو گھر ہیں جن میں ایک کی قیمت فروخت دس لاکھ ہے جبکہ دوسرے کی پچاس لاکھ ہے تو دونوں کے کرایہ میں نمایاں فرق ہو گا۔ گلبرگ میں پانچ پانچ مرلے کے دو مکان ہیں ایک کارنر پلاٹ ہے جبکہ دوسرا ایک ایسی گلی میں ہے کہ جس کا سیورج سسٹم (sewerage system) خراب ہونے کی وجہ سے گلی میں ہر وقت بدبو پھیلی رہتی ہے، تو دونوں کے کرایے میں بہت فرق ہو گا۔ لہٰذا ایک مکان کے کرایے کے تعین میں جن باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری امر ہے اور ان کا لحاظ رکھے بغیر کرایہ عرف میں طے ہی نہ کیا جاتا ہو، تو ان امور کو ملحوظ رکھے بغیر سودی شرح پر کرایے کا تعین کرنے سے وہ کرایہ نہیں بن جاتا ہے، چاہے وہ عام کرایے سے کتنا ہی کم بھی کیوں نہ ہو۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ نے جب انگور بیچتے وقت مارکیٹ ریٹ کو مد نظر نہ رکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مارکیٹ ریٹ کے مطابق بیچنے یا بازار سے اٹھ جانے کا حکم دیا۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ مَرَّ بِحَاطِبِ بْنِ أَبِي بَلْتَعَةَ وَهُوَ يَبِيعُ زَبِيبًا لَهُ بِالسُّوقِ، فَقَالَ

لَهُ عُمَرُ: إِمَّا أَنْ تَزِيدَ فِي السِّعْرِ، وَإِمَّا أَنْ تُرْفَعَ مِنْ سُوقِنَا." [1]

"حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا گزر حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے ہوا جبکہ وہ بازار میں اپنی کشمش بیچ رہے تھے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا یا تم اپنی قیمت بڑھا لو یا پھر ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ۔"

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

غَلَا السِّعْرُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰه، سَعِّرْ لَنَا، فَقَالَ ((إِنَّ اللّٰه هُوَ الْمُسَعِّرُ، القَابِضُ، البَاسِطُ، الرَّزَّاقُ، وَإِنِّي لَأَرْجُو أَنْ أَلْقَى رَبِّي وَلَيْسَ أَحَدٌ مِنْكُمْ يَطْلُبُنِي بِمَظْلِمَةٍ فِي دَمٍ وَلَا مَالٍ)) [2]

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اشیاء کی قیمتیں بہت چڑھ گئیں تو بعض صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمارے لیے قیمتیں یعنی مارکیٹ ریٹ مقرر کر دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ ہی قیمتیں بڑھانے والا ہے۔ وہی رزق تنگ کرنے والا، رزق کشادہ کرنے والا اور بہت زیادہ رزق دینے والا ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے رب سے اس حال میں ملاقات کروں کہ تم میں سے کوئی ایک بھی (یعنی خریدار اور دکاندار) مجھ سے کسی ظلم کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو جو کہ اس کے خون یا مال میں ہوا ہو۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مارکیٹ ریٹ کو مقرر کرنے کا اختیار حکومت وقت کے پاس بھی نہیں ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾ [3]

"سوائے اس کے کوئی تجارت باہمی رضامندی سے ہو۔"

لیکن جب لوگوں کی آزاد مرضی کی تجارت سے ایک مارکیٹ ریٹ طے ہو جائے تو پھر اس کی مخالفت بہت سے معاشرتی و معاشی مفاسد کو جنم دیتی ہے۔ پس اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مارکیٹ ریٹ کے خلاف بیچنے پر حضرت حاطب کو بازار سے اٹھ جانے کا حکم دیا تھا۔

---

1 مالك بن أنس إمام، الموطأ، كتاب البيوع، باب الحكرة والتربص، (دمشق: دار القلم، 1413ھ)، رقم: 2399۔

2 جامع الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله، باب ما جاء في التسعير، رقم: 1314۔

3 سورة النساء، 3: 29۔

اجارہ و اقتناع (Lease purchase scheme)

کاروبار کی اس صورت میں بینک کے پاس ایک شخص جاتا ہے اور بینک کو بتلاتا ہے کہ میں نے فلاں گاڑی یا مشینری خریدنی ہے لیکن میرے پاس رقم نہیں ہے۔ بینک اس شخص کو اپنا ایجنٹ بنا لیتا ہے اور وہ چیز خرید لیتا ہے۔

مثلاً بینک سے ایک شخص نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس نے ٹویوٹا کرولا (Toyota corolla) خریدنی ہے۔ اب بینک اس شخص کو ایجنٹ بنا کر کہے گا کہ اپنی پسند کی ٹویوٹا کرولا خرید لو۔ وہ شخص مثال کے طور پر 20 لاکھ میں وہ گاڑی بینک کے لیے خریدتا ہے تو بینک وہی گاڑی اس شخص کو ایک متعین مدت مثلاً پانچ سال کے لیے کرایے پر دے دیتا ہے اور پانچ سال بعد وہ شخص بینک سے وہی گاڑی ایک معمولی رقم کے عوض خرید لیتا ہے۔

اجارہ و اقتناع پر کیے جانے والے اعتراضات

بینک کے اس کاروبار پر درج ذیل اعتراضات عائد ہوتے ہیں:

پہلا اعتراض: بینک جب کسی شخص کے مطالبے پر ایک گاڑی خریدتا ہے مثلاً وہ 20 لاکھ کی ایک ٹویوٹا کرولا خریدتا ہے تو بینک اس 20 لاکھ کی گاڑی کی اصل قیمت، اصل قیمت کا سود جسے وہ منافع کا نام دیتا ہے اور گاڑی کی انشورنس کا خرچہ وغیرہ ملا کر اس کا حساب کرتا ہے مثلاً یہ 25 لاکھ بنتا ہے۔ اب بینک اس 25 لاکھ کو پانچ سال میں تقسیم کر کے اس کی قسطیں بنا دے گا اور اسی شخص کو کہ جس کے کہنے پر بینک نے وہ گاڑی خریدی تھی، وہ گاڑی پانچ سال کے دورانیے کے لیے کرائے پر دے دے گا اور گاڑی کا کرایہ مارکیٹ ریٹ کی بجائے اس شرح سے وصول کرے گا کہ بینک کو پانچ سال میں وہ 25 لاکھ کرائے کی صورت میں واپس مل جائے۔ اس طرح کرائے کے حیلے سے بینک اس شخص سے پانچ سال میں 25 لاکھ وصول کر لے گا کہ جس میں گاڑی کی اصل قیمت کے ساتھ انشورنس کا خرچہ اور بینک کا سود یعنی منافع بھی شامل ہو گا۔ پانچ سال کے بعد بینک وہی گاڑی اس شخص کو مارکیٹ ریٹ کی بجائے سیکورٹی کی ایک معمولی سی رقم کے عوض بیچ دے گا۔ اس طرح کرائے سے شروع ہونے والے اس تعلق کا نتیجہ بیع کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ بینک اور اس کے کسٹمر (customer) میں پہلے دن سے ہی یہ بات طے ہوتی ہے کہ پانچ سال کا کرایہ وصول کرنے کے بعد بینک اس شخص کو وہ گاڑی ایک معمولی قیمت پر بیچ دے گا۔

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ بینک نے وہ گاڑی زید کو بیچنے کے لیے نہیں خریدی تھی اور جس

قیمت پر گاڑی بینک نے خریدی تھی، اس سے زائد رقم وصول کرنے کے لیے اس نے زید کے ساتھ کرائے کا چکر چلایا، جس میں زید کے لیے آسانی تو یہ تھی کہ وہ کرائے کے نام پر قسطوں میں بینک کو اس کی ساری رقم بمع منافع لوٹا سکتا تھا جبکہ بینک کو یہ فائدہ تھا کہ اس نے سود کو کرائے کا نام دے دیا۔ اگر تو جو بینک وصول کرتا ہے وہ واقعتاً گاڑی کا کرایہ ہے تو کرایہ مارکیٹ ریٹ کے مطابق ہونا چاہیے تھا۔ اگر یہ کرایہ ہی تھا تو بینک کو پانچ سال بعد اسی شخص سے گاڑی بیچنے کا معاہدہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر یہ کرایہ ہی ہے تو بینک کو پانچ سال بعد وہ گاڑی اس شخص کو ایک معمولی قیمت کی بجائے مارکیٹ ریٹ پر بیچنی چاہیے تھی۔ اگر وہ کرایہ ہی ہے تو بینک کو اس کرایے کا تعین گاڑی انشورنس، اس کی اصل رقم اور سودی بینکوں کی شرح سود (kibor) کو سامنے رکھ کر نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس سارے معاملے میں بینک اصلاً مشتری (buyer) نہیں ہے یعنی اس کی اصل حیثیت تو ایک شیء خریدنے کے لیے رقم فراہم کرنے والے (investor) کی ہے کیونکہ گاڑی اسی شخص نے جا کر دیکھی ہے، اسی نے اس کا ماڈل، کلر وغیرہ پسند کیا ہے۔ گاڑی خریدنے کے لیے ساری بھاگ دوڑ بھی اسی نے کی ہے اور بینک نے صرف رقم فراہم کی ہے اور گاڑی اپنے نام کروالی ہے۔ لہٰذا بینک در حقیقت مشتری (buyer) نہیں ہے اگرچہ وہ کاغذوں میں اپنے آپ کو مشتری دکھا رہا ہے۔ پس بینک اس کاروبار میں گاڑیوں کی خرید وفروخت (purchase & sale) نہیں کرتا بلکہ وہ اس مقصد کے لیے رقم فراہم (Financing) کرتا ہے اور ان کو سود پر بیچنے کے لیے کرائے (lease) کا حیلہ ایجاد کرتا ہے۔ علمائے احناف کے متفقہ فتویٰ میں ہے:

> ”عاقدین کا بنیادی مقصد اجارہ کا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ خریداری کا معاملہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ قاعدہ و قانون کی رو سے حکم، اصل مقصد (بیع) پر ہی لگے گا نہ کہ الفاظ (اجارہ) پر، یہ بیع مشروط بالاجارہ ہے جو کہ خلاف شریعت ہے۔“[1]

دوسرا اعتراض: اگر بینک کو خریدار (buyer) مان بھی لیا جائے تو پھر بھی اس کی یہ خریداری (purchase) مصنوعی ہے کیونکہ بینک نے یہ گاڑی زید کے مطالبے پر اس کو بیچنے کے لیے خریدی ہے۔ اور اس قسم کی خرید و فروخت سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔ حضرت حکیم بن حزام فرماتے ہیں:

قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ، يَأْتِينِي الرَّجُلُ فَيُرِيدُ مِنِّي الْبَيْعَ لَيْسَ عِنْدِي أَفَأَبْتَاعُهُ لَهُ مِنَ

[1] مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علماء کرام اور مفتیان عظام کا متفقہ فتویٰ: 5۔

السُّوقِ؟ فَقَالَ: «لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ)) [1]

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے پاس ایک شخص آتا ہے وہ مجھ سے ایسی چیز خریدنا چاہتا ہے جو میرے پاس نہیں ہے تو کیا میں اس کے لیے وہ چیز بازار سے خرید لوں (یعنی بازار سے وہ چیز خرید کر اس کو بیچ دوں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو مت بیچ جو تیرے پاس نہیں ہے۔"

امام ابن العربی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔[2] امام نووی (متوفیٰ 676ھ) نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔[3] امام ابن قدامہ (متوفیٰ 682ھ) نے بھی اس روایت کو صحیح کہا ہے۔[4] امام بن دقیق العید (متوفیٰ 702ھ) نے بھی صحیح کہا ہے۔[5] امام ابن القیم نے اسے محفوظ کہا ہے۔[6] امام ابن حجر (متوفیٰ 852ھ) نے بھی محفوظ کہا ہے۔[7] امام ابن الملقن (متوفیٰ 804ھ) نے اسے صحیح کہا ہے۔[8] علامہ البانی رحمہم اللہ (متوفیٰ 1332ھ) نے اسے صحیح علی شرط الشیخین کہا ہے۔[9]

ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں:

عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَجُلًا أَرَادَ أَنْ يَبْتَاعَ طَعَامًا مِنْ رَجُلٍ إِلَى أَجَلٍ، فَذَهَبَ بِهِ الرَّجُلُ الَّذِي يُرِيدُ أَنْ يَبِيعَهُ الطَّعَامَ إِلَى السُّوقِ، فَجَعَلَ يُرِيهِ الصُّبَرَ وَيَقُولُ لَهُ: مِنْ أَيِّهَا تُحِبُّ أَنْ أَبْتَاعَ لَكَ؟ فَقَالَ الْمُبْتَاعُ: أَتَبِيعُنِي مَا لَيْسَ عِنْدَكَ؟ فَأَتَيَا عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ فَذَكَرَا ذَلِكَ لَهُ، فَقَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ لِلْمُبْتَاعِ: «لَا تَبْتَعْ مِنْهُ مَا لَيْسَ

---

1 سنن أبوداؤد، باب في الرجل يبيع ماليس عنده، رقم: 3503۔

2 ابن العربي، محمد بن عبد الله، عارضة الأحوذي بشرح صحيح الترمذی، (بیروت: دار الفكر، 1415ھ)، 3: 193۔

3 نووی، يحى بن شرف الدين، المجموع شرح المهذب، (بیروت: دار الفكر)، 9: 259۔

4 ابن قدامة المقدسی، موفق الدين عبد الله بن أحمد، الكافي، (بیروت: المكتب الاسلامی، 1399ھ)، 2: 20

5 ابن دقيق العيد، محمد بن علي، الاقتراح في بيان الاصطلاح وما أضيف إلى ذلك من الأحاديث المعدودة من الصحاح، (المكة المكرمة: دار الباز، 1406ھ): 99۔

6 ابن القيم، محمد بن أبي بكر، زاد المعاد في هدى خير العباد، (بيروت: مؤسسة الرسالة، 1423ھ)، 5: 716۔

7 ابن حجر، أحمد بن علي العسقلاني، تهذيب التهذيب، (بیروت: مؤسسة الرسالة، 1416ھ)، 11: 424۔

8 ابن الملقن، عمر بن علي، البدر المنير في تخريج الأحاديث والآثار الواقعة في الشرح الكبير، (السعوديه عرب: دار الهجرة، الطبعة الأولى، 1425ھ)، 6: 448۔

9 ألباني، محمد ناصر الدين، التعليقات الرضية على الروضة الندية، (القاهره: دار ابن عفان، 1420ھ)، 2: 381۔

عِنْدَهُ، وَقَالَ لِلْبَائِعِ لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ)) [1]

"امام مالک رحمہ اللہ (متوفیٰ179ھ) سے مروی ہے کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک آدمی نے کسی دوسرے آدمی سے ایک مدت تک کے لیے کچھ اناج خریدنے کا ارادہ کیا' تو جو بائع(seller) تھا وہ خریدار(buyer) کو اپنے ساتھ بازار لے گیا اور اسے وہاں غلے کے مختلف ڈھیر دکھانے لگا اور خریدار سے کہنے لگا کہ ان میں سے کون سا اناج تجھے پسند ہے میں تجھے وہ خرید دیتا ہوں تو خریدار نے کہا: کیا تو مجھے ایسی چیز بیچ رہا ہے جو تیرے پاس نہیں ہے تو وہ دونوں اپنا معاملہ لے کر حضرت عبد اللہ بن عمر کے پاس آئے تو ابن عمر نے خریدار سے کہا: تو اس سے وہ چیز نہ خرید جو اس کے پاس نہیں ہے اور بیچنے والے سے کہا: تو اس کو وہ چیز مت بیچ جو تیرے پاس نہیں ہے۔"

یہاں تو یہ معاملہ تھا کہ وہ شخص بازار میں خود جا کر خریداری کر رہا تھا لیکن وہ کسی سے بیع کرنے کے لیے ایک بیع کر رہا تھا کہ جس سے صحابیِ رسول نے روکا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی بینک کا کوئی فرد تو بازار میں بھی نہیں جاتا اور رقم فراہم کرتے ہوئے ایک بیع صرف اس لیے کرتا ہے کہ اس نے آگے زید سے ایک مزید بیع کرنی ہے یعنی مستقبل کی ایک بیع کرنے کے لیے وہ ایک دوسری مصنوعی بیع کر رہا ہے اور یہ ممنوع اور ناجائز ہے۔

تیسرا اعتراض: ایک شخص نے بینک سے گاڑی کرائے پر لینے کی خواہش کا اظہار کیا تو بینک وہ گاڑی بک(book) کروا دیتا ہے اور اس گاڑی کے حصول میں بینک کو اگر 6 ماہ لگ جاتے ہیں تو بینک ان 4 ماہ کی ایک مناسب وقت قیمت(opportunity cost) اپنے کسٹمر(customer) سے وصول کر لیتا ہے اور اس کی وصولی کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بینک ان 4 ماہ کے مناسب وقت قیمت کو گاڑی کے کرایے(rent) میں شامل کر کے اس کا کرایہ بڑھا دے گا اور جس قدر گاڑی بینک کو دیر سے حاصل ہو گی مثلاً 6 ماہ بعد ملے گی تو بینک گاڑی کے کرایے میں بھی اسی قدر اضافہ کر دے گا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بینک گاڑی کے کرایے کے تعین کے لیے اس وقفے کو بھی ملحوظ رکھتا ہے جو کہ کسی نئی گاڑی کے حصول میں درکار ہوتا ہے اور بینک اپنے کرایے کا حساب کتاب(calculation) اس دن سے شروع کرتا ہے جس دن سے وہ اپنی رقم فراہم(invest) کرتا ہے۔[2]

---

[1] مالك بن أنس، إمام، مؤطا إمام مالك، باب العينة وما يشبهها، رقم: 2361۔

[2] ذوالفقار علی، حافظ، دورِ حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم، (لاہور: ابوہریرہ اکیڈمی، 2008ء):149، 115۔

چوتھا اعتراض: اگر کوئی شخص بینک سے کوئی گاڑی اجارہ(leasing) پر لیتا ہے مثلاً پانچ سال کے لیے ایک ٹویوٹا کرولا کرایے پر لیتا ہے۔ تین سال کا کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ شخص بینک سے وہ گاڑی خریدنا چاہتا ہے تو بینک کو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس گاڑی کی مارکیٹ ویلیو(market value) لگواتا اور اپنے کسٹمر کو وہ گاڑی فروخت کر دیتا لیکن وہ ایسے نہیں کرتا بلکہ بینک یہ دیکھتا ہے کہ اس نے وہ گاڑی کتنے میں خریدی تھی مثلاً بینک نے وہ گاڑی 20 لاکھ میں خریدی تھی۔ اب بینک یہ دیکھے گا کہ اس گاڑی کی بنیادی قیمت(principal amount) کا کتنے فی صد کرایے کی مد میں تین سالوں میں بینک کو واپس ملا ہے مثلاً تین سال میں بینک کو گاڑی کی اصل رقم کا 60 فی صد واپس ہوا ہے یعنی بینک کو اصل رقم کا 12 لاکھ واپس ملا ہے اور 8 لاکھ باقی ہے' یہ واضح رہے کہ ان تین سالوں میں بینک کو کل رقم صرف 12 لاکھ ادا نہیں ہوئی بلکہ 12 لاکھ سے زاید رقم ادا کی گئی ہے جن میں 12 لاکھ کو بینک نے اصل رقم کی واپسی میں شمار کیا ہے اور اس سے زائد کو گاڑی کے کرایے میں شمار کرتے ہوئے اپنا منافع وصول کیا ہوتا ہے۔

اب بینک ان 8 لاکھ پر پانچ سالہ اجارہ کا معاہدہ ختم کرنے کا پانچ فی صد(termination penalty) جرمانہ لگا کر یہ گاڑی اس شخص کو بیچ دے گا اور اسلامی بینک کا اپنے کسی کسٹمر کو گاڑی بیچنے کا یہ طریقہ بعینہ سودی بینکوں کے طریق کار کے مطابق ہے۔ لہٰذا بینک، پانچ سالہ اجارہ(leasing) کے دوران کسی بھی مرحلے پر اپنے کسٹمر کو گاڑی بیچنے کے لیے بنیادی رقم(principal amount) اور باقی رہنے والی قیمت(remaining amount) کو سامنے رکھ کر گاڑی فروخت کرتا ہے۔ اگر یہ واقعتاً اجارہ تھا اور گاہک(cutomer) بینک کو کرایہ ہی ادا کر رہا تھا تو اجارے کے کسی مرحلے پر گاڑی خریدتے وقت گاڑی کے کرایے کی مد میں بنیادی رقم کی ادائیگی کا لحاظ کیوں رکھا گیا اور گاڑی کی مارکیٹ ویلیو کو نظر انداز کیوں کیا گیا؟ حقیقت بالکل واضح ہے کہ بینک اور اس کا گاہک پہلے دن سے ہی اس گاڑی کی آپس میں خرید و فروخت چاہتے ہیں اور وہ خرید وفروخت ان کے درمیان طے بھی ہے لیکن اس بیع کو اجارے کی شکل دینے کے لیے یہ سارا چکر چلایا گیا ہے تا کہ بینک اپنا سود کرایے کے نام پر وصول کر سکے اور کسٹمر کرایے کے نام پر سہولت کے ساتھ اس گاڑی کی قیمت ادا کر سکے۔

پانچواں اعتراض: بینک گاڑی خرید لیتا ہے اور اسکا مالک بن جاتا ہے۔ لہٰذا وہ گاڑی کی ملکی(ownership) کے اخراجات(expenses) اٹھانے کا پابند ہوتا ہے۔ بینک گاڑی سے متعلقہ یہ اخراجات اٹھا تو لیتا ہے لیکن وہ اپنے

کسٹمر سے یہی اخراجات کرایے کی مد میں وصول کر لیتا ہے۔ مثلاً بینک گاڑی کا ایک عمومی کرایہ ہر ماہ کے حساب سے 30 ہزار رکھتا ہے لیکن وہ پہلے ماہ گاڑی کا کرایہ 60 ہزار وصول کرتا ہے تا کہ گاڑی کی ملکیت حاصل کرنے میں اسے جو اخراجات برداشت کرنے پڑے ہیں وہ ان کو اپنے کسٹمر سے وصول کر لے۔ پس ایک ماہ گاڑی کا کرایہ 60 ہزار ہوتا ہے تو دوسرے ماہ 30 ہزار، یہ کیسا کرایہ ہے جو ایک ماہ کے محدود وقفے میں اس قدر اوپر نیچے ہوتا ہے۔ مفتی ڈاکٹر عبد الواحد صاحب لکھتے ہیں:

> "کار اجارہ سکیم میں میزان بینک کی جاری کردہ کرایہ کی عبوری تشخیص میں درج ہے کہ پہلے ماہ کا کرایہ رجسٹریشن اور باربرداری کے اخراجات کو بھی شامل ہے اور باقی مہینوں کے کرائے انشورنس (یا تکافل) کی رقم کو بھی شامل ہیں۔"[1]

چھٹا اعتراض: بینک جب گاڑی خرید کر کسی شخص کو اجارے پر دیتا ہے تو اسے اس گاڑی کی انشورنس (insurance) کروانی پڑتی ہے جو کہ تمام علما کے نزدیک ناجائز ہے۔ اس اعتراض کا عموماً اسلامی بینک یہ جواب دیتے ہیں کہ سٹیٹ بینک آف پاکستان (SOB) ان کو کار فنانسنگ (car financing) کی اجازت اسوقت تک نہیں دیتا ہے جب تک وہ اس کی انشورنس نہ کروالیں۔ لہذا وہ گاڑی کی انشورنس کروانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اسلامی بینک تجارت کا ایک ایسا ذریعہ کیوں اختیار کرتا ہے کہ جس کے لیے اسے ایک ناجائز کام کرنا پڑتا ہے۔

اسلامی بینکوں نے انشورنس کے مسئلے کا اب یہ حل نکالا ہے کہ تکافل (Takaful) کے نام پر اسلامی انشورنس (islamic insurance) کو متعارف کروایا ہے۔ اس تکافل کو حقیقی اسلامی انشورنس کا نام دینا خود محل نظر ہے۔[2]

ساتواں اعتراض: اگر کوئی گاہک مقررہ وقت پر گاڑی کی قسط ادا نہ کرے تو بینک اس پر جرمانہ عائد کرتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا بھی رہتا ہے، یہ ناجائز ہے۔ یہ جرمانہ بینک کے زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروادیا

---

1 ذوالفقار علی، حافظ، بیع سلم کے اصول اور اسلامی بینک، ماہنامہ محدث، لاہور، ستمبر 2008ء، جلد 40، شمارہ 9: 31۔

2 عبد الواحد، مفتی ڈاکٹر، جدید معاشی مسائل اور حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ، (کراچی: مجلس نشریات اسلام، 2008ء): 92۔132۔

جاتا ہے۔ مولانا مفتی حافظ ذوالفقار صاحب لکھتے ہیں:

"سودی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ وصول کرتے ہیں جو کہ اسلامی بینک کے زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروایا جاتا ہے۔ یہاں بھی سودی فارمولا اختیار کیا جاتا ہے کہ ایک تو جرمانہ واجب الادا رقم کے تناسب سے عائد کیا جاتا ہے اور دوسرا تاخیر کی مدت بڑھنے کے ساتھ جرمانہ کی رقم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔"[1]

اسلامی بینکوں کے محققین اس جرمانے کے جواز کے لیے ابن دینار مالکی رحمہ اللہ (متوفیٰ 212ھ) کے ایک قول سے دلیل پکڑتے ہیں۔ علمائے احناف کے متفقہ فتویٰ میں ہے:

"اہل علم سے امید کی جاتی ہے کہ بینکوں کے مالی جرمانہ کے جواز کے لیے ابن دینار مالکی رحمہ اللہ کے مرجوح متروک کالمعدوم قول پر اعتماد کرنے والے حضرات امام محمد رحمہ اللہ کے مذکورہ مزاج اور موقف کو تسلیم کرتے ہوئے مرابحہ و اجارہ کے سودی حیلوں کے ذریعے سرمایہ کاری کو ناجائز کہیں گے۔"[2]

مولانا مفتی حافظ ذوالفقار صاحب نے ابن دینار مالکی رحمہ اللہ کے اس قول کا مفصل و محقق جواب اپنی کتاب میں دیا ہے۔[3] طوالت کے خوف سے ہم اسے یہاں نقل نہیں کر رہے ہیں۔

آٹھواں اعتراض: بینک اجارہ میں اگر گاڑی کا نقصان ہو جائے تو بڑے نقصانات بینک کے ذمے جبکہ چھوٹے نقصانات گاہک (گاڑی اجارہ پر لینے والے) کے ذمہ ہوتے ہیں۔ علمائے احناف کے متفقہ فتویٰ میں ہے:

"مروجہ اجارہ میں بڑے نقصانات بینک کے ذمے اور چھوٹے موٹے نقصانات گاہک (لیزی) کے ذمے ہوتے ہیں 'گو کہ معمول کے استعمال کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ معاملہ اجارے کا ہو (کما لفظاً) یا بیع کا ہو (کما هي الحقيقة) بہر صورت نقصانات کی ذمہ داری کی یہ تقسیم بالکل ناجائز ہے۔ کیونکہ اجارہ، بشمول اسلامی بینکوں کے تمام عقود شرکت و مضاربت اور مرابحہ وغیرہ کے، ان میں سرمایہ دار کا سرمایہ اور مال 'عمیل اور استعمال کرنے والے کے ہاتھ میں امانت ہوتا

---

1 دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم: 115۔
2 مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علماء کرام اور مفتیان عظام کا متفقہ فتویٰ: 3۔4۔
3 دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم: 115۔118۔

ہے۔امانات پر جان بوجھ کر غفلت اور تعدی کے بغیر ضمان نہیں آتا۔جبکہ یہاں پیشگی معاہدے میں استعمال کرنے والے پر زیر استعمال چیز کے بعض نقصانات کی ذمہ داریاں عائد کی جاتی ہیں۔اگر یہ معاملہ بالکلیہ صحیح طور پر اجارہ ہو تو اجرت کے علاوہ مستاجر پر اضافی بوجھ ڈالنا شرط فاسد اور "أکل بالباطل" ہے۔اگر اس معاملے کو بیع کہیں تو بائع (بینک) پر بڑے نقصان ڈالنا پہلے کی نسبت بڑا افساد ہے،ایسی بیع ناجائز ہوتی ہے۔"[1]

نواں اعتراض: اجارے میں اسلامی بینک کرایے کا تعین عام سودی بینکوں کی شرح سود کے مطابق کرتا ہے جو حالات کے تحت بدلتا بھی رہتا ہے[2] اور یہ ناجائز ہے۔[3] علمائے احناف کے متفقہ فتوی میں ہے:

"اجارہ میں اجرت کی شرح کی تعیین اور تناسب کے لیے روایتی سود کی شرح کو معیار بنانا ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔کیونکہ سودی معاملات کے ساتھ اولاً مشابہت 'ثانیاً اشتباہ بھی ہے۔دوسرا یہ کہ روایتی سود کی شرح مختلف اوقات میں بدلتی رہتی ہے یا افراط زر کی وجہ سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ایسا اجارہ جس میں اجرت کی شرح و تناسب یقینی طور پر پیشگی معلوم نہ ہو' وہ ناجائز ہے۔"[4]

بیع مرابحہ (cost plus profit)

مرابحہ کا لفظ 'ربح' سے بنا ہے جس کا معنی 'نفع' کا ہے۔سلف صالحین کے ہاں بیع مرابحہ سے مراد وہ بیع ہے کہ جس میں ایک شخص ایک چیز خریدتا ہے اور پھر وہی چیز کسی دوسرے شخص کو زائد قیمت پر بیچ دیتا ہے لیکن اس بیع اور ایک عام بیع میں فرق یہ ہوتا ہے کہ بیع مرابحہ میں بیچنے والا اپنے گاہک کو اس شیء کی اپنی قیمتِ خرید صحیح صحیح بتلاتا ہے اور پھر اس قیمتِ خرید پر جائز منافع کا مطالبہ بھی کرتا ہے مثلاً کوئی دوکاندار جب کسی شخص کو یہ کہے کہ میں نے یہ کپڑا ایک سو روپیہ میں خریدا ہے اور تم کو ایک سو دس میں بیچتا ہوں تو یہ بیع مرابحہ ہو گی۔لیکن اگر دوکاندار گاہک کو اپنی قیمت خرید نہ بتلائے اور بھاؤ تاؤ کے ذریعے اس کو کپڑا کسی منافع پر بیچ دے تو بیع مرابحہ نہ ہو گی بلکہ اس کو 'بیع مساومہ' کہتے ہیں۔فقہائے اربعہ کے ہاں بیع مرابحہ کا معنی و مفہوم واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے

---

1 مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علماء کرام اور مفتیان عظام کا متفقہ فتویٰ:5۔

2 دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم:112۔114۔

3 جدید معاشی مسائل:134۔

4 مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علماء کرام اور مفتیان عظام کا متفقہ فتویٰ:5۔

ہیں:

"هو البيع بمثل الثمن الأول مع زيادة ربح وصورة المرابحة كما ذكر المالكية هى أن يعرف صاحب السلعة بكم اشتراها ويأخذ منه ربحاً إما على الجملة مثل أن يقول اشتريتها بعشرة وتربحني دينارا أو دينارين وإما على التفصيل وهو أن يقول تربحني درهما لكل دينار أو نحوه أى إما بمقدار مقطوع محدود وإما بنسبة عشرية. وتعريفها عند الحنفية نقل ما ملكه بالعقد الأول وبالثمن الأول مع زيادة ربح. وعند الشافعية والحنابلة هى البيع بمثل رأس المال أو بما قام على البائع وربح درهم لكل عشرة ونحو ذلك بشرط علم العاقدين برأس المال."[1]

"اس سے مراد وہ بیع ہے کہ جس میں پہلی قیمت کے ساتھ کچھ اضافہ بھی لیا جاتا ہے۔ اور مالکیہ نے بیع مرابحہ کی مثال یوں بیان کی ہے کہ دوکاندار اس بات کی وضاحت کرے کہ اس نے وہ مال کتنے میں خریدا ہے اور گاہک سے اپنی قیمت خرید کے علاوہ کچھ منافع بھی لے مثلاً اجمالاً یوں نفع وصول کرے کہ میں نے یہ چیز دس دینار میں خریدی ہے تم مجھے اس کا ایک یا دو دینار زیادہ دیتے ہو یا پھر دکاندار اپنے گاہک سے تفصیلاً منافع طے کر لے مثلاً گاہک کو یہ کہے کہ قیمت خرید کے ہر دینار کے عوض میں تم سے ایک درہم منافع لوں گا وغیرہ یعنی وہ اپنے منافع کو محدود صورت میں بیان کر دے یا اس کو دہائیوں کے ساتھ مخصوص کر لے۔ احناف کے نزدیک بیع مرابحہ کی تعریف یہ ہے کہ پہلے عقد بیع (agreement of sale) کے ذریعے وہ جس چیز کا مالک بنا ہے، اسے پہلی قیمت سے زائد منافع پر آگے فروخت کر دینا۔ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اس سے مراد وہ بیع ہے کہ جس میں بائع (seller) اس چیز کی اصل قیمتِ خرید اور اخراجات کے علاوہ زائد منافع حاصل کرتا ہے مثلاً ہر دس درہم کے بدلے ایک درہم وغیرہ، بشرطیکہ خریدار اور بیچنے والے کو اصل قیمت کا علم ہو۔"

یہ تو بیع مرابحہ کی وہ تعریف تھی جو سلف صالحین نے بیان کی ہے۔ اسلامی بینکوں نے بیع مرابحہ کی ایک نئی تعریف متعارف کروائی ہے جو درج ذیل ہے۔ ڈاکٹر محمد عمران اشرف عثمانی لکھتے ہیں:

"The term is ' however' now used to refer to a sale agreement

[1] وهبة الزحيلي، الدكتور، الفقه الإسلامي وأدلته، (دمشق: دار الفكر، الطبعة الثانية عشرة)، 5: 3765۔

whereby the seller purchases the goods desired by the buyer and sells them at an agreed marked-up price the payment being settled within an agreed time frame either in installments or lump sum" [1]

"اب یہ اصطلاح ایک ایسے معاہدے کے لیے استعمال ہوتی ہے کہ جس میں بیچنے والا کسی چیز کو گاہک کی خواہش پر خریدتا ہے اور پھر اس چیز کو اصل قیمت خرید کے علاوہ ایک متفقہ منافع کے عوض اسی گاہک کو بیچ دیتا ہے۔گاہک کے ذمہ رقم کے بارے میں بھی یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ وہ ایک خاص وقت میں بیچنے والے کو ادا کر دی جائے گی' چاہے وہ اکھٹی ادا کی جائے یا قسطوں کی شکل میں ہو۔"

بیع مرابحہ پر اعتراضات

اسلامی بینکوں کے ذریعے کی جانے والی اس بیع پر درج ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

پہلا اعتراض: بینک نے بیع مرابحہ کی جو اصطلاح استعمال کی ہے وہ اس اصطلاح کا ایک غلط استعمال ہے۔فقہا نے بیع مرابحہ کی جس شکل کو بعض روایات کی بنا پر جائز قرار دیا ہے، وہ اس صورت سے بہت مختلف ہے جس کو آج کل اسلامی بینک بیع مرابحہ کے نام سے استعمال کر رہے ہیں۔اسلامی بینکوں نے ایک ایسی بیع کا نام 'بیع مرابحہ' رکھ دیا ہے جو 'بیع مرابحہ' نہیں ہے بلکہ شرعی نصوص کے خلاف بیع ہے جیسا کہ حضرت حکیم بن حزام کی روایت ہم نقل کر چکے ہیں۔

فقہائے اربعہ اور ڈاکٹر عمران اشرف عثمانی صاحب کی بیع مرابحہ کی تعریف میں بہت فرق ہے جو ان تعریفوں کا ایک تقابلی تجزیہ کرنے والے شخص کو واضح طور نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر ایک شخص کپڑے کی مارکیٹ میں گیا، اس نے ایک ہزار کا کپڑا خریدا، اس کپڑے کو اپنی دکان میں رکھا، کچھ وقت کے بعد اس کے پاس کوئی گاہک کپڑا لینے آیا تو اس نے گاہک کو اصل قیمت خرید بتلائی اور کہا کہ میں تمہیں یہ کپڑا گیارہ سو میں بیچوں گا۔اب اس شخص نے محنت کی ہے، اپنا وقت کھپایا ہے، کپڑا خرید کر دکان میں رکھا ہے وغیرہ۔یہ خرید و فروخت کا ایک معروف طریقہ ہے۔جبکہ یہی کام اگر کسی بینک کے ذریعے ہو تو اس کا طریقہ کچھ یوں ہو گا۔ایک شخص کہ جس کو کپڑا چاہیے وہ

---

[1] Ashraf Usmani Dr, Meezanbank's guide to islamic banking, page:250-

بینک کے پاس جائے گا اور اس سے کہے گا کہ مجھے یہ کپڑا چاہیے۔ اب بینک اس شخص کے لیے یہ کپڑا ایک ہزار روپے میں خریدے گا اور حقیقت یہ ہے کہ دکان پر جا کر اس کپڑے کی خریداری بھی وہی شخص کرتا ہے اور بینک صرف رقم فراہم کر کے کاغذوں میں اس کپڑے کا مالک بن جاتا ہے۔ اب بینک وہی کپڑا اس شخص کو گیارہ سو میں قسطوں پر بیچ دیتا ہے۔ اس صورت میں بینک حقیقت میں کوئی محنت نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ ایک جگہ بیٹھا سرمایہ فراہم کرتا ہے اور صرف کاغذی کاروائی کے بدلے منافع کماتا ہے۔ بیع کی اس صورت سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ جس میں ایک چیز بیچنے والے کے پاس موجود نہ ہو اور وہ اسے بیچ رہا ہو جیسا کہ ہم حضرت حکیم بن حزام کی روایت سے یہ بات معلوم کر چکے ہیں۔ علمائے احناف کے متفقہ فتوی میں ہے:

> ”مرابحہ بنوکیہ اور مرابحہ فقہیہ میں کوئی مماثلت نہیں' مرابحہ فقہیہ میں ابتدا سے قیمت و ثمن کا متعین ہو کر ذمے میں آنا اور لاگت کا یقینی علم اور وجود ضروری ہے جبکہ مرابحہ بنوکیہ میں بینک ثمن کی ادائیگی پہلے نہیں کرتا یا لاگت کا وجود نہیں ہوتا۔ اس لیے مرابحہ بنوکیہ' اصطلاحی مرابحہ تو در کنار عام کسی بیع کے تحت بھی نہیں آتا۔“[1]

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بیع مرابحہ میں بینک کسی چیز پر اپنے گاہک سے جو منافع لیتا ہے وہ مارکیٹ کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ اسلامی بینک سودی بینکوں کے باہمی تبادلے میں شرح سود میں چار یا پانچ فی صد کا اضافہ (KIBOR + 4 or 5) کرتا ہے اور اس کا حساب لگا کر اپنے گاہک سے اس چیز کا منافع وصول کر لیتا ہے۔[2]

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ بینک کے پاس جب ایک شخص آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اسے فلاں چیز کی ضرورت ہے مثلاً اسے ایک کنال زمین کی ضرورت ہے تو بینک اس زمین کی اصل قیمت میں (karachi internal banks offered rate + 4 or 5) کا اضافہ کرتا ہے۔ اور اس شخص سے یہ معاہدہ کر لیتا ہے کہ وہ بینک سے اسی قیمت پر وہ زمین خریدے گا۔ یعنی بینک نے ایک چیز خریدی ہی نہیں ہے اور نہ ہی اس کے قبضے میں ہے اور وہ اس کو ایک متعین منافع پر بیچنے کا معاہدہ کر رہا ہے۔

اسلامی بینک عام طور پر اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ ایک معاہدہ ہی تو ہے، ہم نے کوئی بیع تھوڑی کی

---

1 مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علمائے کرام اور مفتیان عظام کا متفقہ فتوی:4۔

2 دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم:136۔

ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اسلامی بینک نے حیلہ کرتے ہوئے کاغذوں میں اسے ایک معاہدہ(contract) قرار دیا ہے حالانکہ بینک اس شخص سے ایک ایسی چیز کی بیع کر رہا ہوتا ہے جو اس کے پاس موجود نہیں ہے اور اس نے ابھی خریدنی ہے۔اگر تو یہ بیع نہیں ہے جیسا کہ بینک کا دعوی ہے بلکہ یہ ایک معاہدہ ہے جو بینک اور اس کے ایجنٹ کے درمیان ہے کہ وہ ایجنٹ اس سے فلاں چیز اس قیمت پر خریدے گا تو ایجنٹ وہ معاہدہ توڑنے کا مجاز ہے یعنی بینک جب ایک چیز کسی شخص کی خواہش پر اس معاہدے کے ساتھ خرید لیتا ہے کہ وہ شخص وہی چیز بینک سے زائد قیمت پر خریدے گا تو اسلامی بینک کے بقول بیع تو ابھی تک نہیں ہوئی لہٰذا وہ شخص معاہدہ توڑ بھی سکتا ہے،ہاں یہ کر لے کہ معاہدہ توڑنے کے بعد اپنے مسلک کے مطابق اگر اس کا کوئی کفارہ بنتا ہے تو وہ اسے ادا کر دے۔لیکن اسلامی بینک اس صورت حال کو کبھی بھی قبول نہیں کرتا ہے اور اگر کسٹمر بیع کا یہ وعدہ پورا نہ کرے اور بینک کو یہ شیء کسی اور شخص کو سستے داموں فروخت کرنی پڑے تو بینک اپنا یہ نقصان پہلے کسٹمر سے پورا کرتا ہے۔[1] لہٰذا یہ معاہدہ نہ ہوا کیونکہ بینک اپنے آپ کو گاہک کے ساتھ اس چیز کی خریداری سے پہلے ایک معاہد(contracter) کی بجائے ایک بائع(seller) کے طور پر پیش(treat) کر رہا ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بینک کی تو ایک شیء خریدنے کی نیت ہی نہ تھی بلکہ گاہک کے زیادہ قیمت پر خریدنے کی یقین دہانی کروانے پر بینک نے وہ چیز خریدی ہے۔لہٰذا بینک نے حقیقت میں خرید و فروخت نہیں کی ہے بلکہ سود کو وصول کرنے کا ایک حیلہ ایجاد کیا ہے۔[2]

تیسری بات یہ ہے کہ بینک بیع مرابحہ سے پہلے اپنے گاہک سے دس فیصد رقم ٹوکن منی (token money) کے طور پر لیتا ہے تاکہ اگر وہ شخص متعلقہ چیز کی خریداری کے بعد بینک کے ساتھ کیا ہوا اپنا معاہدہ توڑ دے اور بینک کو اس چیز کی خریداری میں نقصان ہوا ہو تو بینک اس رقم سے اپنا نقصان پورا کر سکے۔بیع سے پہلے ہی اپنے کسی گاہک سے اس رقم کا لینا اور اس کا استعمال بھی ناجائز ہے۔مولانا مفتی حافظ ذوالفقار علی صاحب لکھتے ہیں:

> "سودی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی (Non Risk) ہیں۔اس کی واضح مثال یہ ہے کہ جب کوئی اسلامی بینک کے ساتھ مرابحہ یا اجارہ کا معاملہ کرنے جاتا ہے تو بینک اس سے اچھی خاصی رقم

---

1 دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم:142۔143۔

2 أیضاً: 137۔

جو عام طور پر مطلوبہ چیز کی قیمت کا دس فی صد ہوتی ہے 'ٹوکن منی (حامش جدیہ) کے نام سے وصول کرتا ہے تاکہ اگر بعد میں وہ چیز لینے سے انکار کر دے اور بینک کو وہ چیز دوسری جگہ قیمتِ لاگت سے کم پر فروخت کرنی پڑے تو بینک اس ٹوکن منی سے اپنا نقصان پورا کر سکے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا اسلامی بینکوں کے نزدیک یہ خطرہ مول لینا رسک میں شامل نہیں؟ ممکن ہے اسلامی بینکنگ کے محققین فرمائیں کہ ہمارے نزدیک اس قسم کے خطرے میں پڑنا رسک میں شامل نہیں، اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دوسری جگہ بیچنے پر بینک کو فائدہ ہو، کیا وہ یہ نفع خریداری کا آڈر دینے والے شخص کو دینے کے لیے تیار ہے؟ ظاہر ہے بینک اس پر تیار نہیں ہو گا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بینک نقصان اٹھانے کے لیے تیار نہیں تو نفع کس بنیاد پر لیتا ہے۔"[1]

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ بینک کے پاس جب ایک شخص آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اسے فلاں چیز کی ضرورت ہے تو بینک اس شخص کو اپنا ایجنٹ یا وکیل بنا کر وہ چیز مثلاً پانچ سو میں خرید لیتا ہے اور پھر اسی شخص کو وہی چیز چھ سو میں قسطوں پر بیچ دیتا ہے۔ اگر بینک نے اپنے ایجنٹ یا وکیل کو کوئی چیز خریدنے کے لیے یکم مئی کو رقم فراہم کی لیکن وہ چیز بینک کو بیس مئی کو ملی اور اکیس مئی کو بینک نے وہی چیز اپنے ایجنٹ کو بیچ دی۔ اب بینک جب اپنے منافع کا حساب لگائے گا تو وہ اس منافع کا حساب (caculation) یکم مئی سے شروع کرتا ہے یعنی جس دن اس نے اپنے ایجنٹ کو وہ رقم دی تھی۔ یعنی نہ مال بینک کے قبضے میں موجود ہے اور نہ ہی وہ مال آگے فروخت ہوا ہے لیکن اس کا منافع شمار (calculate) ہو رہا ہے۔

پانچواں اعتراض: یہ ہے کہ بینک سے ایک شخص جو بھی چیز خریدے مثلاً زمین، گاڑی، مشینری، سائیکل، زیورات، کپڑا وغیرہ تو بینک ان سب کا منافع ایک ہی جیسا لے گا یعنی اصل قیمت میں سودی بینکوں کے باہمی تبادلہ کی شرح سود پر چار یا پانچ فی صد اضافی شمار کر کے شامل کر لے گا۔ یہ کیسی تجارت کہ جس میں ایک موٹر سائیکل، کار، کپڑا، زمین، زیورات یہاں تک کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کا منافع ایک ہی جیسا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ حقیقی منافع نہیں ہے اگر یہ حقیقی منافع ہوتا تو بینک کے ذریعے مختلف اشیاء کی خریداری پر مختلف شرح کے ساتھ بینک منافع وصول کرتا جیسا کہ مارکیٹ میں مختلف اشیاء کا منافع بھی مختلف ہوتا ہے۔ 10 لاکھ کا سونا بیچتے وقت ایک سنار

[1] دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم: 118۔119۔

کو جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ 10 لاکھ کی گاڑی یا زمین بیچتے وقت اس کے مالک کو حاصل ہونے والے منافع کے کبھی بھی برابر نہیں ہوتا۔

چھٹا اعتراض: یہ ہے کہ سود میں رقم کے عوض رقم حاصل (charge) کی جاتی ہے یعنی کسی شخص نے ایک ہزار قرض دیا اور اس پر گیارہ سو واپس لے لیے۔ اس بیع میں بینک بھی یہی کام کر رہا ہے کہ وہ ایک ہزار کی شیء پر گیارہ سو وصول کر رہا ہے۔ اسلامی بینک یہ کہے گا کہ اس نے بذریعہ بیع گیارہ سو وصول کیے ہیں۔ ہم یہ کہیں گے کہ بینک نے اس معاملے کو حیلے سے بیع بنایا ہے۔ درحقیقت یہ بیع نہیں ہے کیونکہ بینک تو صرف کاغذی کاروائی کرتے ہوئے ایک ہزار مہیا کر دیتا ہے اور اس ایک ہزار کے بدلے گیارہ سو وصول کر لیتا ہے جبکہ بازار سے اس چیز کی خریداری اور اس کے لیے بھاگ دوڑ وہی شخص کرتا ہے۔ اور جو چیز اس بات کو مزید مؤکد کرتی ہے وہ یہ ہے کہ بینک نے اس چیز کا منافع مارکیٹ کے مطابق وصول نہیں کیا بلکہ اس چیز کی اصل قیمت پر (KIBOR + 4) کا اضافہ کر کے اس کو اپنے کسٹمر سے وصول کر لیا ہے۔

ساتواں اعتراض: اگر اس کو بیع مان بھی لیا جائے تو یہ 'کرنسی کی بیع مرابحہ' ہے اور 'کرنسی کی بیع مرابحہ' فقہاء کے نزدیک بالاتفاق ناجائز ہے، یعنی بینک سے ایک ہزار لے لو اور پھر اپنی من پسند کوئی چیز خرید لو اور پھر اس ایک ہزار کے بدلے بینک کو گیارہ سو واپس کر دو۔ لہٰذا ایک ہزار کی بیع گیارہ سو کے بدلے میں ہے جو حرام ہے۔

آٹھواں اعتراض یہ ہے کہ اگر کوئی گاہک 'بیع مرابحہ' میں بینک کو مقررہ وقت پر قیمت ادا نہ کرے تو بینک اس پر جرمانہ وصول کرتا ہے جو ناجائز ہے۔ مولانا مفتی حافظ ذوالفقار صاحب لکھتے ہیں:

> "قرآن و حدیث میں تاخیر پر جرمانہ کا تصور موجود نہیں اور نہ ہی فقہاء اس کی اجازت دیتے ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: 'قتل سمیت کوئی گناہ انسان کے مال کو حلال نہیں کرتا'۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: 'سزا صرف جسمانی ہے نہ کہ مالی۔ فقہ حنبلی کی معروف کتاب 'المغنی' میں ہے: 'تعزیر مارنے' قید کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے ہوتی ہے اس کا کوئی حصہ کاٹنا، یا اسے زخمی کرنا، یا اس کا مال لینا جائز نہیں کیونکہ جن لوگوں کی اقتداء کی جاتی ہے ان کے حوالے سے شریعت میں اس طرح کی کوئی چیز بیان نہیں ہوئی'۔ فقہائے حنفیہ کے نزدیک مالی جرمانہ جائز نہیں۔ چناچہ علامہ ابن نجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 970ھ) لکھتے ہیں: خلاصہ کلام یہ ہے کہ حنفی مذہب کے مطابق

مال لے کر تعزیری سزا جائز نہیں۔ فتاوی دارالعلوم دیوبند میں 'در مختار' کے حوالے سے لکھا ہے: 'حنفی مذہب کے مطابق مالی جرمانہ درست نہیں۔"[1]

نواں اعتراض: بینک کے پاس جب کوئی شخص بیع مرابحہ کے لیے آتا ہے تو بینک اس شخص کی مطلوبہ چیز خریدنے کے لیے اس کو اپنا وکیل بنالیتا ہے اور اسی گاہک کے ذریعے وہ چیز خریدتا ہے اور اس نے مستقبل میں اپنے اسی گاہک کو وہ چیز فروخت بھی کرنی ہے۔ علاوہ ازیں بینک اس چیز کی خریداری سے پہلے یا گاہک کو وکیل بنانے سے پہلے اپنے اس گاہک وکیل سے یہ معاہدہ بھی کرتا ہے کہ وہ جب بینک کے وکیل کی حیثیت سے فلاں چیز کسی دوسری پارٹی سے خرید لے گا تو اب وہ وکیل گاہک، بینک کے مالک بن جانے کے بعد اس چیز کو بینک سے خریدنے کا پابند ہو گا۔ بینک کی یہ وکالت، وکالتِ فاسدہ ہے۔ علمائے احناف کے متفقہ فتوی میں ہے:

> "مرابحہ بنوکیہ میں بینک کا کاغذی معاہدہ جس پر پیشگی دستخط ہو چکے ہیں' وہی اصل ہے اس کے بعد وکالت کے مختلف مراحل شرعی اعتبار سے وکالت ہرگز نہیں بن سکتے بلکہ لین دین کی ذمہ داری ایک شخص کے گرد گھومنے کی وجہ سے صراحتاً وکالت فاسدہ ہے۔ اس لیے وکالت کا یہ طریقہ کار شرعاً محض کاغذوں کی لکیریں اور لفظی ہیر پھیر ہے۔ حقیقت میں ایک ہی فرد بائع اور مشتری بن رہا ہے جو کہ صراحتاً خلاف شرع ہے۔ پس مرابحہ بنوکیہ خالصتاً سودی حیلہ ہے۔ اس مرابحہ کا شرعی اصطلاحی مرابحہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"[2]

دسواں اعتراض: ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ بینک جب کسی گاہک کو بیع مرابحہ میں اپنا وکیل بناتا ہے تو اس کے ساتھ اس چیز کی خریداری کا ایک پیشگی معاہدہ بھی کرتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے جب کوئی شخص بطور وکیل بینک کی طرف سے متعلقہ چیز خرید لیتا ہے تو فوراً ہی وہ شخص متعلقہ چیز کو اپنے قبضے اور ضمان میں منتقل کرنے کا پابند ہوتا ہے جو کہ ناجائز ہے۔ علمائے احناف کے متفقہ فتوی میں ہے:

> "مرابحہ بنوکیہ میں آڈر فارم کے ضمیمہ کی رو سے پیشگی معاہدہ کے تحت گاہک مال کو فوراً اپنے قبضے اور ضمان میں منتقل کرنے کا پابند ہے، ورنہ نقصان گاہک پر لازم ہو گا۔ یہ ناجائز ہے۔"[3]

---

1 ذوالفقار علی، حافظ، اسلامی بینک کاری کے حقیقت، ہفت روزہ الاعتصام، لاہور، 20 تا 26 جون 2008ء، جلد 60، شمارہ 25: 25۔

2 مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علمائے کرام اور مفتیان عظام کا متفقہ فتوی: 4۔

3 أیضاً: 4۔

مضاربہ

ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ بینک کے دو بنیادی کام ہیں۔ایک لوگوں سے ان کی رقوم بطورِامانت یا قرض وصول کرنا اور دوسرا ان رقوم کو آگے سودی قرضوں پر جاری کرنا۔ اسلامی بینک اپنے کھاتے داروں (depositers)سے مضاربت ومشارکت کی بنیاد پر رقوم وصول کرتے ہیں اور پھر ان کو کاروبار میں لگاتے ہیں۔ اور اسلامی بینکوں کے کاروبار کا بڑا حصہ مشارکہ متناقصہ‘اجارہ و اقتناع اور بیع مرابحہ پر مشتمل ہے جن کی شرعی حیثیت کے بارے میں ہم بالتفصیل گفتگو کر چکے ہیں۔ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی بینکوں کا یہ کاروبار غیر شرعی حیلوں پر مشتمل ہے لہٰذا اس سے حاصل شدہ منافع بھی درست نہیں ہے یا کم از کم مشتبہ امور میں ہے کہ جن سے بچنے کو عین تقویٰ قرار دیا گیا ہے۔پس اسلامی بینک میں کسی قسم کا کوئی اکاؤنٹ کھلوا کر منافع حاصل کرنا درست نہیں ہے۔

دوسری ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ بینک اپنے کھاتے داروں سے جو مضاربت کرتے ہیں اس میں وہ اپنے طے شدہ نفع کی شرح کے علاوہ بھی اپنے ذاتی اخراجات‘مختلف قسم کی فیسیں اور الاؤنسز وغیرہ بھی نکالتے ہیں جو ناجائز ہیں۔علمائے احناف کے متفقہ فتویٰ میں ہے:

> ”مضاربہ میں کھاتہ دار رب المال اور بینک مضارب ہوتا ہے،مال مضاربت میں بینک کا حصہ شرعاًصرف اور صرف حاصل شدہ نفع کی طے شدہ شرح ہے،اس کے علاوہ بینک کے لیے شرعاً اپنے ذاتی انتظامی اخراجات کی مد میں رقم لینا،اسی طرح مختلف فیسیں لینا یا کسی قسم کا معاوضہ اور الاؤنس،مال مضاربت سے منہا کرنا ناجائز ہے۔مگر اسلامی بینک ایسا کرتے ہیں۔“[1]

تیسری بات یہ ہے کہ اسلامی بینک مضاربت میں اصل اہمیت وترجیح یعنی وزن کو دیتے ہیں۔مولانا مفتی حافظ ذوالفقار حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

> ”اسلامی بینکوں میں نفع کی تقسیم کے لیے رقم کی کمی بیشی کی بنیاد پر ڈیپازیٹر کی رقوم کا الگ الگ وزن مقرر کیا جاتا ہے جس کی رقم زیادہ ہو اس کا وزن زیادہ رکھا جاتا ہے اور جس کی رقم تھوڑی ہو اس کا کم۔مثلاً میزان بینک کی ویب سائیٹ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق ماہ اپریل 2008ء

---

[1] مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علمائے کرام اور مفتیان عظام کا متفقہ فتویٰ:6۔

کا ویٹج اسائنڈ weightage assigned یوں ہے: اگر رقم 10000 (دس ہزار) سے لے کر ایک لاکھ سے کم تک ہو تو ویٹج اسائنڈ 0.31 ہو گا اور اگر رقم ایک لاکھ سے لیکر 0.99 ملین (دس لاکھ سے کم) تک ہو تو ویٹج اسائنڈ 0.36 تک ہو گا۔ گویا اسلامی بینکوں میں کم رقم رکھوانا جرم ہے جس کی سزا یہ ہے کہ اس کی رقم کا وزن بھی کم رکھا جائے۔ ویٹج اسائنڈ کو رقم کی کمی بیشی کے ساتھ مربوط کرنا عدل کے خلاف ہے۔ 1987ء میں خود اسٹیٹ بینک اس کو غلط کہہ چکا ہے۔ یہاں ایک اور ناانصافی یہ بھی کی جاتی ہے وہ یہ کہ مضاربہ میں بینک کی اپنی رقم بھی ہوتی ہے۔ بینک اس رقم کا ویٹج اسائنڈ ڈیپازیٹر سے مختلف رکھتا ہے۔ مثلاً اسی ماہ اپریل میزان بینک نے اپنی رقم کا ویٹج اسائنڈ 1.7 رکھا ہے۔ یہ فرق خود اس اصول کے بھی خلاف ہے وہ اس طرح کہ اگر بینک نے مثلاً مضاربہ میں ایک ارب روپیہ لگایا ہے اور اس میں نوے کروڑ کھاتہ دار کا اور دس کروڑ بینک کا' تو اس اصول کے مطابق کھاتہ داروں کی ویٹج اسائنڈ بینک کی رقم سے زیادہ ہو جانا چاہیے کیونکہ مجموعی اعتبار سے کھاتہ داروں کی رقم زیادہ ہے لیکن بینک نے الٹا اپنی رقم کا ویٹج اسائنڈ زیادہ رکھا ہوتا ہے۔"[1]

چوتھی بات یہ ہے کہ اسلامی بینکوں میں شراکت کے لیے ایک رواں کھاتہ کھول دیا جاتا ہے کہ جس میں مختلف افراد، مختلف اوقات، میں مختلف رقمیں نکلواتے بھی ہیں اور ساتھ ہی فاضل سرمایہ بھی جمع کرواتے رہتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی بینک نے ایک سال کے لیے ایک پراجیکٹ پر کام شروع کیا ہے تو اس کا ایک رواں کھاتہ کھول دیا جائے گا جس میں لوگ اس ایک سال کے دوران اپنا سرمایہ جمع کرواتے رہیں گے اور نکلواتے بھی رہیں گے۔

اب ایک سال بعد جتنا نفع ہو گا تو بینک اس نفع کو یوں تقسیم کرتا ہے کہ وہ سب سے پہلے یہ معلوم کرتا ہے اوسطاً فی یوم کتنا سرمایہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے وہ ایک دن میں ایک روپیہ پر حاصل ہونے والا نفع معلوم کرتا ہے اور پھر ایک شخص نے جتنے دن کے لیے اس کھاتے میں اپنی رقم رکھی تھی' اس نفع کو ان دنوں سے ضرب دے دی جاتی ہے۔ اس طرح یومیہ بنیادوں پر نفع کی تعیین کی جاتی ہے۔ نفع کی تعیین کا یہ طریقہ ظن و تخمین پر مبنی ہے جو اظہر من الشمس ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے بینک کے پراجیکٹ کے شروع ہونے پر دس لاکھ بینک میں جمع کروائے اور دس دن بعد ہی نکال لیے جبکہ بینک کو ان دس دنوں میں کوئی نفع حاصل نہ ہوا تھا' اب

[1] دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم: 127۔

بینک کو مہینے کے اگلے بیس دنوں میں جو نفع حاصل ہوا تو اس نے اس نفع کی فی یوم فی روپیہ اوسط نکال لی اور اپنے اس کھاتے دار کو بھی اس نفع میں کچھ حصہ دے دیا جو کہ در حقیقت اس کا حصہ نہیں بنتا ہے۔ علمائے احناف کے متفقہ فتویٰ میں ہے:

"شرکت و مضاربت میں منافع کی تقسیم کا مجوزہ طریقہ کار' اسلامی تقاضے پورے نہیں کرتا بلکہ منافع کی حقیقی شرح کے بجائے روزانہ پیداوار کی بنیاد پر یا 'وزن' دینے کے نام سے فرضی اور تخمینی شرح طے یا ادا کی جاتی ہے جو کہ شرکت و مضاربت کے اساسی اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔"[1]

حاصل بحث

اسلامی بینکوں کا مروجہ نظام غیر شرعی حیلوں پر مشتمل ہے کہ جس میں بظاہر جزءاً جزءاً فقہی ضابطوں کی پابندی ہو رہی ہے لیکن ان ضابطوں کے جاری کرنے میں جو شرعی مقاصد تھے وہ بری طرح پامال ہو رہے ہیں۔ لہٰذا مروّجہ اسلامی بینکنگ ایسے حیلوں پر مشتمل ہے جو کہ شرعی مقاصد کے حصول میں رکاوٹ ہیں۔ غیر سودی بینک ہوں یا سودی بینک ہوں، دونوں طرح کے بینک حقیقت میں تجارت و کاروبار (Trade) نہیں کرتے بلکہ پیسوں کا لین دین کرتے ہیں۔ غیر سودی بینکوں کی جن جائز خدمات سے ضرورت کے نظریے کے تحت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، وہی خدمات اسلامی بینکوں سے لینا بھی جائز ہے۔

لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ایسے اجتماعی اداروں کی تخلیق اسلامی معاشرے کی ضرورت ہیں کہ جن میں حقیقی بنیادوں پر شرعی اصولوں کی روشنی میں تجارت، مضاربت و مشارکت وغیرہ رائج ہو۔ عام طور پر عوام الناس کی طرف سے یہ بات سننے میں آتی ہے کہ علماء ہر بات پر اعتراضات تو کر دیتے ہیں لیکن کوئی حل پیش نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ حل تو موجود ہے لیکن سرمایہ دار طبقے کے مادہ پرستانہ نظریات و اخلاقیات اور عامۃ الناس کی ضرورت کے نام تعیشات پر مبنی زندگی کی خواہش نے ایک ایسی ذہنیت کو جنم دے دیا ہے کہ وہ اس حل کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ایک سیدھا سا اصول یہ ہے کہ مضاربت یا مشارکت میں نقصان بھی ہو سکتا ہے اگرچہ مختلف جدید علوم و مینجمنٹ سائنسز کی روشنی میں متوقع نقصان کے خطرے کو کم تو کیا جاسکتا ہے لیکن یہ ختم

[1] مروّجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علمائے کرام اور مفتیان عظام کا متفقہ فتویٰ: 7۔

کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن آج کون سے ایسے انویسٹرز (investores) ہیں جو اس نقصان کو برداشت کرنے کے خطرے کو قبول کرتے ہوئے انویسٹ (invest) کرنے پر تیار ہوں۔ بہر حال یہ ایک سادہ سی مثال اس لیے دی گئی ہے کہ کاروبار یا تجارت' ایک کاروبار یا تجارت ہی ہے جس کے اپنے کچھ لوازمات و مقتضیات ہیں مثلاً نقصان کا اندیشہ وغیرہ۔ اگر ہم ان لوازمات کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے تو پھر وہ کاروبار نہیں رہے گا بلکہ کچھ اور ہی بن جائے گا جیسا کہ اسلامی بینکوں میں بالفعل ایسا ہوا ہے۔ لہٰذا لوگوں کی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے اجتماعی اداروں کے قیام کی ذمہ داری اگر علماء پر عائد ہوتی ہے تو اس سے کئی گنا زیادہ ذمہ داری معاشرے پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے ذہنوں کو اسلامی اقتصاد کے اصولوں کی قبولیت کے لیے تیار کریں۔ بہر حال اسلامی اقتصادی نظام، کہ جس میں کوئی ادارہ حقیقی معنوں میں ایک تجارتی ادارہ ہو اور اسلامی کے روحانی نظام کی بنیاد پر قائم ہو، پر تحقیقی و فنی کام کی ضرورت و اہمیت مسلم ہے اور اس موضوع پر بحث کو آگے بڑھانا چاہیے۔ اور اس کے لیے آئیڈیل صورت یہی ہے کہ بینکوں کو اسلامی لاحقہ لگا کر ان سے یہ خدمت لینے کی بجائے مضاربہ کمپنیاں بنائی جائیں کہ جو حقیقی معنوں میں تجارت کریں۔

اور اگر فی الحال یہ سوچ کر کہ ہم حالت جنگ میں ہیں اور حالت جنگ میں مریضوں کی تعداد زیادہ ہو تو تھانے میں ہی بیڈ لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے، لہٰذا ہمیں بینکوں کے اداروں کی اعتماد کی بنا پر ان سے عبوری دور کے لیے کچھ کام لے لینا چاہیے تو پھر اس کا حل یہ ہے کہ بینک کار لیزنگ کے لیے شوروم بنائیں کہ جہاں گاڑیاں کھڑی ہوں اور اب بینک انہیں چاہے قسطوں پر مہنگے داموں بیچ دیں اور ہاؤس فنانسنگ کے لیے اسلامی بینک بڑی بڑی ہاؤسنگ سوسائٹیوں کی طرح جگہ خریدیں اسے ڈی ویلپ کریں، کالونیاں اور سوسائیٹیاں بنائیں اور پانچ اور دس مرلے یا ایک دو کنال کے گھر قسطوں پر فروخت کریں یہ کاروبار ہے اور نظر ہی آتا ہے کہ کاروبار ہے لیکن اسلامی بینک اس طرف بالکل ہی نہیں آتے وہ صرف پیسوں کے لین دین تک محدود رہنا چاہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بینک محض ایک ادارہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عالمی معاشی نظام کیپٹل ازم کی بنیادی اکائی (basic unit) ہے جو عالمی سیاسی نظام ڈیموکریسی کا ایک اقتصادی وژن ہے۔ اس پس منظر اور تناظر میں بینک کو محض مٹی گارے سے بنی ہوئی ایک عمارت نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب و تمدن کی ایک علامت ہے۔ پس ایسے اداروں کو محض تمدن کی ترقی سمجھ کر آنکھیں بند کر کے قبول کر لینے کی

دعوت درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ یہ اپنے ساتھ فکر اور تہذیب دونوں لے کر آتے ہیں۔ جیسا کہ مغربی زبان کی تعلیم محض زبان کی تعلیم نہیں ہے بلکہ یہ زبان اپنے ساتھ مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب کو بھی لٹریچر کے نام پر منتقل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفکر پاکستان علامہ اقبال رحمہ اللہ (متوفیٰ 1938ء) نے بینکوں کے نظام کے بارے کہا تھا:

ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود — نور حق از سینہ آدم ربود

تاتہ وبالانہ گردد ایں نظام — دانش و تہذیب ودین، سودای خام